قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

بدل الاشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۴۸ روپے
غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

جلد (۴۱)
مئی ۱۹۸۸ء
نمبر ۵

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

i حمیت نام تھا جس کا......

ii سانحہ راولپنڈی

۲۔ حدیث کی صحیح پوزیشن ——— ۱۰

۳۔ نقد و نظر ——— (ابلیسجد) ——— ۹۱

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴۳ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حمیت نام تھا جس کا.....!

پچھلے دنوں آنجہانی مسٹر گاندھی کی پوتی مسز تارا بھٹاچارجی کے (بقول ان کے) پاکستان کے دورۂ غیر سرکاری کے دوران، پاکستان کی طرف سے جس بے حسی اور بے حمیتی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا، اس سے علامہ اقبالؒ کی وہ مشہور نظم جو انہوں نے غلام قادر روہیلہ کے عنوان سے لکھی ہے اور جو اپنے اندر غیرت مندوں کے لئے بزرگوں عبرتوں کا سامان رکھتی ہے، بار بار ہمارے ذہن میں ابھری اور بالخصوص اس کے آخری شعر نے تو تڑپا تڑپا دیا۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی اس نظم میں یہ بتا کر کہ غلام قادر روہیلہ نے کس طرح شاہ تیمور کے گھرانے کی شہزادیوں سے رقص کرایا اور اس کے بعد اس نے اپنی کمر سے بندھے خنجر کو کھول کر پاس ہی رکھ دیا اور بعد ہر اپنے آپ پر نیند طاری کر لی اس خیال سے کہ شاید کوئی غیرت مند شہزادی، اسی کے خنجر سے اس کا کام تمام کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن جب ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر وار نہ کیا تو کچھ دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور کہا کہ میری نیند دراصل نیند نہیں تھی بلکہ ایک بہروپ تھا یہ جاننے کے لئے کہ کیا اس قدر بے عزتی اور رسوائی کے بعد کسی شہزادی کی غیرت اسے، مجھے قتل کرنے پر آمادہ کرتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہوا اور سارے زمانے پر یہ راز کھل گیا کہ:-

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

طلوع اسلام مارچ ۱۹۸۸ء کے لمعات میں بتایا گیا تھا کہ متحدہ قومیت کے لئے جو دام ہائے ہمرنگ زمین بچھائے گئے تھے ان میں سے تصوف کے متعلق یہ سمجھا گیا تھا کہ یہ سب سے کامیاب حربہ ہے اور اس کے لئے آنجہانی مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، دیوان لال چند ناول رائے، (مولانا) ابوالکلام آزاد مرحوم اور مسٹر جی ایم سید کے نقطہ ہائے نظر پیش کئے گئے تھے۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ داداے کے نظریات کی صدائے بازگشت کس طرح پوتی کی نوکِ زبان پر آ ہی گئی۔ مسز تارا بھٹاچارجی نے پاکستان کی فقید المثال ضیافت اور عزت افزائی سے بہرہ ور ہو کر، پاکستان سے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ:-

دونوں ممالک میں صوفیوں اور اولیائے کرام کے پیغامات پر عمل کیا جائے۔ اور یہ کہ وہ مہاتما گاندھی اور راج گوپال اچاریہ کا دونوں ممالک کے درمیان محبت اور اتحاد کا پیغام لے کر پاکستان آئی تھیں۔ اور انہیں پاکستان میں اپنے ان دونوں عزیزوں کے بارے میں بڑا پیار ملا ہے“

(روزنامہ جنگ لاہور - ۹ اپریل ۱۹۹۲ء صفحہ ۲، کالم ۱)

جہاں تک اس پہلو پر غور کیا جائے، اس میں شک نہیں کہ دونوں ممالک میں عام طور پر صوفیوں اور اولیائے کرام کی طرف لوگوں کے منسوب کردہ پیغامات جو تصوف کو پھیلانے کی کوششوں ہی پر منتج ہوتے ہیں۔ جن کا محمد عربی علیہ التحیۃ والسلام کے اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ واحد ذریعہ ہیں جو آنجہانی مسٹر گاندھی کی ناکام آرزوؤں کو کامیاب بنا کر متحدہ قومیت کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

قارئین کرام اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندو نے آج تک پاکستان کے قیام کو قبول نہیں کیا اور متحدہ قومیت کے خواب کس طرح اُسے وقفِ اضطراب رکھتے ہیں۔

لیکن آنجہانی مسٹر گاندھی کی روح کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آجکل پاکستان میں اُن کے دادا کی دی ہوئی راہوں پر بڑی تن دہی سے عمل ہو رہا ہے اور مملکتِ پاکستان کا گوشہ گوشہ تصوف کو پھیلانے میں کوشاں ہے۔

کہا جائے گا کہ اپنے مہمانوں سے عزت و احترام سے پیش آنا ہم مسلمانوں پر واجب ہے۔ لیکن خدارا، اپنی اس مہمان نوازی کے فرض کو نبھاتے ہوئے اتنا تو نہ بھول جائیے کہ آپ کا مہمان کون ہے اور اس کا کس خانوادے سے تعلق ہے۔ اگر آپ کے ذہنوں سے یہ بات اتر گئی ہو تو ہم یاد کرا دیں کہ یہ اُسی مسٹر گاندھی کی پوتی ہے جس نے پاکستان بننے سے ۳ دن پہلے کہا تھا کہ:

”اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے، ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔“

(دی ٹرانسفر آف پاور اِن انڈیا صفحہ ۱۹۱، مصنفہ اے، جی ایلوک)

مارچ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا، تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور [illegible] نے کھل کر کہا کہ:

”میں پوری جرأت اور جسارت سے کہے گا۔ اور اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے

کی ضرورت اس لئے پیش آرہی ہے کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے مذہب دار پہ سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔"

(مسٹر گاندھی کا بیان مورخہ ۷ اپریل ۱۹۴۰ء بحوالہ طلوع اسلام جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے اسی سلسلہ مضامین کی دوسری قسط میں ۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ:۔

"میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔"

(طلوع اسلام جون ۱۹۴۰ء)

۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا:۔

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔"

ملاحظہ فرمائیے، خدائے ذوالجلال کے متعین فرمودہ دو قومی نظریہ کو باطل نظریہ کہا جا رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ..... (۶۴/۲)

"اس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کچھ کافر (یعنی خداوندی کو تسلیم نہ کرنے والے) بن گئے اور کچھ مومن (ان قوانین کو ماننے والے)۔"

جب اللہ کے فضل و کرم سے "اُمّتِ مسلمہ ہندیہ" کی قائداعظم علیہ الرحمتہ کی زیر قیادت مساعی سے "پاکستان" بن گیا تو اس سے ہندوؤں کے دل پہ کیا گزری۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہا تھا کہ:۔

"ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔"

اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنا پڑیں۔"

(آرگنائزر، ۳ جولائی ۱۹۴۷ء)

اور دوسری طرف، تقسیم ہند پر، کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے دستخط کرنے والے، آنجہانی پنڈت نہرو اپنی قوم سے یہ کہہ رہے تھے کہ:۔

"ہماری سکیم یہ ہے کہ اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔"

(پاکستان فیسز انڈیا۔ ص ۹۹)

اُس وقت کے برطانیہ کے وزیر اعظم، لارڈ ایٹلی نے، برطانوی پارلیمنٹ میں تقسیم ہند کے بل پیش ہونے پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:۔

"ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے اُمید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔"

انہوں نے ایسا ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ پچیس (۲۵) سال کی مدت کا تعین کیا تھا۔

خدا کے فضل سے پاکستان بنے، آج اکتالیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ گو ہم آج تک اس میں وہ مقاصد حاصل نہیں کر سکے جن کے لئے اِسے حاصل کیا گیا تھا لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، ہندو اپنی ہزار خواہشوں کے خلاف، پاکستان کو قائم و دائم دیکھ کر (تمام برہم) اِسے مٹانے کے لئے کیا کیا پیچ و تاب نہیں کھا رہا ہو گا اور کیا کیا سازشیں نہیں کر رہا ہو گا!

ہندوؤں کے دلوں میں کس قسم کے اُبال اُٹھ رہے ہیں، اُن کا کچھ اندازہ ان کے لیڈروں کے مندرجہ ذیل بیانات سے ہو سکتا ہے۔ ان کے ایک لیڈر راجہ مہندر پرتاپ نے (۱۹۵۰ء میں) یہ پیشگوئی اور مشورہ دیا کہ:۔

"جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنا بریں، میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر

پاکستان کو ختم کر دے۔"

(ویر بھارت $\frac{12}{50}$ ۲۱)

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ:-

"ہم زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان اور سکے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔"

اور اس کے لئے انہوں نے واقعی پاکستان سے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں بھرپور جنگیں کیں اور پاکستان کے ایک حصہ کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد بھی ان کی کوششوں میں کمی نہیں آئی اور پاکستان کے یہاں وہاں کے حصوں پر برابر قبضے کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام ان سازشوں کی نشاندہی کرتا چلا آرہا ہے اور کرتا چلا جائے گا۔ کیونکہ اس کے نزدیک پاکستان کا حصول دینی فریضہ تھا اور اس کی بقا، سلامتی اور اس میں قرآنی نفاذ کا قیام ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ ان سازشوں کے بال (خواہ نعرے) کو پھیلانے کی صورت میں ہوں (خواہ) مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مخالفین پاکستان کی برسیاں منانے کی شکل میں یا مسٹر گاندھی کی برتھ، اور دیگر ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں کے خیر سگالی کے دوروں کی شکل میں، سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے متحدہ قومیت، کے خواب کو حقیقت میں بدلنا۔

ضمناً آپ نے دمہاتما گاندھی اور راج گوپال اچاریہ کے، دونوں ممالک کے درمیان محبت دوستی اور اتحاد کے اس پیغام کی جھلک بھی مسٹر گاندھی، نہرو اور دوسرے ہندو لیڈروں کے بیانات میں دیکھ لی ہے، جو مسٹر تارا چند جی لے کر پاکستان آئی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو، پاکستان کا ازلی دشمن ہے اور جب تک ہمارے عوام اور اعیانِ حکومت اسے سازوکار انہوں سے ایسا تسلیم کر کے اس کی سازشوں کے سدِباب کے لئے قرآن کریم کی ابدی ہدایات پر عمل پیرا نہیں کرتے، روسیاہی اور ذلت کے سوا کچھ ہمارے حصہ میں نہیں آ سکتا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا۟ مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ ٱلْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ وَمَا تُخْفِى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ○ ($\frac{3}{118}$)

"اے جماعتِ مومنین! اپنی جماعت کے سوا کسی کو صاحبِ خصوصیت (راز دار) نہ بناؤ۔ یہ لوگ تمہاری تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی باتوں / مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم عقل و ہوش سے کام لے کر ان کی طرف سے محتاط رہو۔

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد بھی سن لیجئے۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ ۳/۲۸

جماعتِ مومنین کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ کفار کو اپنا دوست اور رفیق بنائیں جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔

قرآن کریم کی ان واضح ہدایات کے علی الرغم، ہم ان "خوش سگالی کے جذبات" لے کر آنے والوں کو نیاز کے دانوں کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں اور ان کی آؤ بھگت کے لئے اپنے دامن کی وسعتوں میں کوئی کمی نہیں پاتے۔ مومن اور منافق میں قرآن نے ایک بیّن فرق یہ بتایا ہے کہ مومن کی زبان پر وہی کچھ ہوتا ہے جو اس کے دل میں ہو اور منافق کی زبان سے جو کچھ سنائی دیتا ہے وہ اس کے دل میں نہیں ہوتا اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے اُسے وہ کبھی زبان پر نہیں لاتا۔ ذرا پہلے آپ اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد پڑھ چکے ہیں جس میں اس نے بتایا ہے کہ تمہارے خلاف جو بغض، کینہ اور عداوت کے جذبات کفار کے دلوں کو ہر وقت وقفِ اضطراب رکھتے ہیں اس کی کچھ جھلک کبھی کبھی، اُن کے شدّتِ جذبات میں، اُن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میں تمہیں مل جاتی ہے لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتا ہے۔

یاد رکھیئے، ہمیں مہمان نوازی کو صرف معقول حد تک رکھنا چاہیئے اور کبھی اتنا آگے نہیں جانا چاہیئے جس سے ہم نظریۂ پاکستان اور اسلام سے روگردانی کے گھناؤنے اور ناقابلِ معافی جرم کے مرتکب ہوں۔ اور نہ ہی اپنے مہمانوں کو ایسے بیان دینے کی اجازت دینی چاہیئے جو ہمارے موقف و مسلک کے خلاف ہوں اور اس کا ثبوت دینا سب سے پہلے ہمارے اعیانِ حکومت کا فرض ہے!

آنجہانی مسٹر گاندھی پاکستان کا بدترین دشمن تھا۔ ان کی قوم اگر انہیں مہاتما کہتی ہے تو
حق بجانب ہو لیکن ہمارے اپنے زعماء اور اخبارات پاکستان۔ کے اس بدترین دشمن کے
جسے "مہاتما" کا خطاب استعمال کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہمیں یہ
بھولنا چاہیئے کہ اپنے دشمن کو نہ پہچاننے والے زیادہ دیر تک آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب نہیں
رہ پاتے۔

حذر اے چیرہ دستاں ، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں !

۲۔ سانحہ راولپنڈی

۱۰ اپریل کا سانحہ راولپنڈی، جو اوجڑی کیمپ کے فوج کے اسلحہ ڈپو میں اسلحہ کو آگ لگنے کی وجہ سے رونما ہوا، ساری قوم کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر راولپنڈی اور اسلام آباد میں بہت سی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اور بے شمار انسان زندگی بھر کے لئے اپاہج ہو کر رہ گئے۔ اس کے علاوہ تباہ شدہ عمارتوں اور اہم تنصیبات کی شکل میں بہت بڑا نقصان بھی ہوا جس کا صحیح صحیح اندازہ لگانے میں کچھ وقت لگے گا اور ان سب پر مستزاد اس بیش قیمت اسلحہ کا نقصان جس کے لئے ہم دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی جنگ عظیم میں بھی کسی ایک شہر پر اتنے راکٹ اور بم نہیں گرے جتنے اس مختصر سے وقت میں راولپنڈی اور اسلام آباد پر گرے۔

اس قیامت صغریٰ کے دوران، قوم نے جس ہمت، مردانگی، اخوت اور انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا وہ ہم سب کے لئے فخر کا باعث ہے۔ حکومت نے بھی ہر سطح پر بروقت ضروری اقدامات کر کے اپنے فرائض کی ادائیگی میں جانفشانی سے کام لیا۔

لیکن، ہمیں انتہائی دکھ ہوا، جب اس عظیم اور تباہ کن سانحہ کو، جو یقیناً حفاظتی اقدامات کی طرف سے غفلت اور کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اعلیٰ ترین مناصب کی جانب سے "اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری آزمائش" کہہ کر اپنی کوتاہیوں اور ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی خود نگر اور احسان ناشناس واقع ہوا ہے، جو ہمیشہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کو اپنے حسن تدبر، فراست اور دانش و بینش کا فطری نتیجہ کہہ کر اپنا سر فخر سے بلند کرتا ہے اور اپنی کوتاہیوں اور ناکامیوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ۔

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ۝ (۴۲/۳۰)

تو پھر جو مصیبت بھی آتی ہے۔ وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ (انفرادی غلطیوں کی وجہ سے یا غلط اجتماعی نظام کی وجہ) اور بہت کچھ سے تو وہ درگذر ہی کر دیتا ہے۔

مزید فرمایا کہ:-

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ...... (۴/۷۹)

تمہاری زندگی میں جو خوشگواری بھی آتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جو مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہیں۔

اس کا اصول یہ ہے کہ:-

...... وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝ (۳۳/۳۸)

اللہ کا امر مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

اور اس کا مقرر کردہ پیمانہ یہ ہے کہ حادثات اس وقت پیش آتے ہیں جب حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتی جائے۔

اس سانحہ عظیم کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ:-

۱۔ جو بے گناہ افراد اس سے متاثر ہوئے ہیں ان کے علاج، صحت اور آبادکاری کے لئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اور ضروری اقدامات جلد از جلد بغیر وقت ضائع کئے اٹھائے جائیں۔

۲۔ صحیح صحیح تحقیقات کے ذریعہ پتہ لگایا جائے اور قوم کو بتایا جائے کہ

i شہری آبادیوں میں فوج کے اسلحہ ڈپو رکھنے کا ذمہ دار کون ہے؟

ii اسلحہ ڈپو میں حفاظتی اقدامات میں کہاں دراڑ پڑی جو قوم کو اس تباہی کا سامنا کرنا پڑا اور حفاظتی اقدامات میں اس ناکامی کا ذمہ دار کون ہے۔؟

iii مستقبل میں ایسے حادثات کی روک تھام کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔

یاد رکھیئے۔ اپنی اصلاح وہی کر سکتا اور ایک بار ہونے والے حادثات کے بار دگر وقوع پذیر ہونے کے نقصانات سے وہی بچ سکتا ہے جو قدم اوّل کے طور پر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی ذمہ داری قبول کرے۔

ترسیلاتِ زر

رقوم اشتراک مجلہ طلوعِ اسلام فقط۔ بنام ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ ۵۴ — ۹۷۲-۳ } حبیب بینک لمیٹڈ مین مارکیٹ
تمام دوسرے مقاصد۔ بنام طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر ۳۵-۱۰۷-۴۱ } برانچ گلبرگ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث کی صحیح پوزیشن

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ ایک قوم ہیں۔ یہ دو قومی نظریہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن سکے۔ اور جس میں اللہ کی نازل کردہ کتاب 'قرآنِ حکیم' کے اصول و اقدار کی حکمرانی ہو۔ یہ نظریۂ پاکستان ہے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح ؒ کی زیرِ قیادت حصولِ پاکستان کی جو کٹھن جنگ میں ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء کی مخالفتوں کے علی الرغم کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح نے کرۂ ارض کے نقشہ پر ایک نئی مملکت کو ابھرتے دیکھا جو اپنے وجود میں اسلام کے دو قومی نظریہ کے حق ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت بنی۔ اور جسے قرآن کریم کے عطا کردہ نظامِ حیات کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا۔

نیشنلسٹ علماء اور دیگر مخالفِ پاکستان عناصر نے مملکتِ پاکستان کے قیام کو اپنے لیے شکستِ پندار کا مسئلہ بنا لیا اور چونکہ وہ اس کے قیام کو روک نہ سکے تھے اُن میں سے اکثر ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ اور یہاں آ کر انہوں نے ایسی سازشوں کے جال بچھانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا جن سے کم از کم اس مملکت میں اسلامی نظام (یعنی قرآنی قوانین و اقدار و احکام) کا نفاذ ممکن نہ ہو سکے۔

یوں تو یہ داستانِ جگر پاش طول طویل ہے (اسے بالتفصیل طلوعِ اسلام کے دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں محترم پرویز صاحب کے اس مقالہ کی صورت میں پیش کیا جا چکا ہے جس کا عنوان ہے "اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش" اور اسے یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں) لیکن ہم اس کے صرف اس گوشے کے متعلق بات کریں گے۔ جسے علماءِ کرام نے متفقہ طور پر اپنایا اور جس کے نتیجہ میں ہمارا اللہ تعالیٰ سے اس مملکت میں قرآن کی حکمرانی قائم کرنے کا وعدہ آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔

علماءِ کرام نے، جو قیامِ پاکستان تک یہ کہتے رہے کہ نہ ایسی مملکت کی ضرورت ہے اور نہ اس کے قیام کا امکان، یہاں بکہ یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ یہ مملکت، اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حاصل کی گئی ہے اس لیے اس کے آئین کی بنیاد

قرآن وسنت "پر ہونی چاہیے۔ وہ سب جانتے تھے کہ اگر یہ ہو جائے تو قیامت تک اس مملکت میں کوئی ایسا آئین نہیں بن سکے گا جو پاکستان میں رہنے والے مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ لہٰذا انہوں نے اپنی اجتماعی کوششوں سے اسے بنیادی قراردادِ مقاصد میں شامل کر دیا۔

ہم نے جو اُوپر کہا ہے کہ سب علماء یہ جانتے تھے کہ اگر ایسا ہو جائے تو اس مملکت میں کوئی ایسا آئین نہیں بن سکے گا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ تو یہ محض الزام تراشی نہیں۔ اسے آپ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی زبان سے سنیے، گو یہ اعتراف کرنے میں انہوں نے ۲۳ سال کا طویل عرصہ لگا دیا۔

"کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔"

(جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار "ایشیا" ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

شاید آپ یہ سمجھے ہوں کہ اس اعتراف کے بعد انہوں نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا ہوگا۔ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا اور ساتھ کے ساتھ اپنا وہی مطالبہ بھی دہراتے رہے کہ پاکستان کا آئین کتاب وسنت کے مطابق بناؤ۔ (یا للعجب!)

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام علماء کے نزدیک اسلام کا وہ تصور ہی نہیں جو بانیانِ پاکستان علیہم الرحمۃ کے سامنے تھا۔ ان کے نزدیک اسلام، خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ جو صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر ارکانِ اسلام کو ادا کرنے سے قائم ہو جاتا ہے۔ جبکہ بانیٔ پاکستان حضرت قائد اعظمؒ اور ان کے رفقاء اسلام کو ایک نظامِ زندگی، ایک SOCIO ECONOMIC SYSTEM جانتے تھے اور اسے عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک الگ آزاد مملکت کے حصول کے لیے کوشاں تھے جو انہوں نے بالآخر حاصل کر لی۔

اگر قائد اعظم علیہ الرحمۃ کچھ دن اور زندہ رہتے تو آپ اپنے قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے اَن گنت بیانات کے مطابق اس مملکت میں قرآن کا نظام کر دیتے اور یہ مملکت کب کی اسلامی بن گئی ہوتی اور ہمارے خوابوں کی تعبیر ہمیں اس جنتِ ارضی کی شکل میں مل گئی ہوتی جو اس کے نتیجہ میں یقیناً پیدا ہوتی۔ (ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ محترم پرویزؒ صاحب کے کہنے کے مطابق پاکستان میں نافذ ہونے والے قرآنی نظامِ حیات کا جس قدر واضح اور غیر مبہم نقشہ قائد اعظم کے ذہن میں تھا وہ آپ کے رفقاء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا) لیکن دلِ حسرتا! کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور مخالفِ پاکستان عناصر کو اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے (اپنی تیئیں) کھلا میدان مل گیا۔

طلوعِ اسلام اپنی بساط کے مطابق قوم کے سامنے اس فریب واہی کو بے نقاب کرتا آیا ہے۔ جب تک قوم اسے نہیں سمجھ لیتی کہ اسلام میں قوانین کی بنیاد، جو بطور ضابطۂ مملکت نافذ ہو سکیں اور جن کی اطاعت ہر فردِ مملکت پر لازمی ہو، صرف اور صرف قرآنِ حکیم ہی بن سکتا ہے، اس وقت تک پاکستان میں (بلکہ یوں کہیے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی)

اسلامی نظام کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اسلام اور پاکستان دشمن عناصر بآہنگ بلند یہ کہتے رہیں گے کہ "اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"

اس لیے شدید ضرورت ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ جذبات سے ہٹ کر خالصتہً علمی سطح پر جائزہ لیا جائے کہ سنت جسے دوسرے الفاظ میں احادیث منسوب الی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟ اس کے لیے ہم ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" کا پہلا باب "حدیث کی صحیح پوزیشن" پیش کرتے ہوئے دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں کہ سوچئے کہ "کیا قرآن کریم کے علاوہ کسی اور چیز کو بھی آئین پاکستان کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے"؟ اب آپ مذکورہ باب ملاحظہ فرمائیے!

معاشرتی امور میں بالعموم، اور مذہب کی دنیا میں بالخصوص، بعض باتیں اس طرح مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں کہ ان کے متعلق کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی حالانکہ ان کے مسلّمہ ہونے کی دلیل اور سند اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ باتیں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آتی ہیں۔ ان پر غور و فکر نہ کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ذہنِ انسانی عام طور پر بڑا سہل انگار واقع ہوا ہے۔ غور و فکر کے لئے اسے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت سے جی چراتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کسی مسلّمہ کے گرد مذہبی تقدس کا ہالہ قائم کر دیا جائے تو اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے انسان ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے، تھرتھراتا ہے۔ وہ اسے سنگین جرم اور شدید گناہ سمجھتا ہے کہ اس پر غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ اگر اسے غور و فکر کی اہمیت بھی بتائی جائے تو اس کے غور و فکر کی حد اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ اگر اسے کوئی ایسی دلیل مل جائے جو اس مسلّمہ کی تائید کرتی ہو تو وہ اسے قابلِ قبول قرار دے کر بطور سند پیش کر دیتا ہے لیکن جو دلیل یا سند اس کے خلاف جائے۔ اسے جھٹ سے رد کر دیتا ہے۔ پھر اُسے نہ اپنے داخلی اضطراب و تذبذب سے کہیں زیادہ خطرہ مذہب پرست طبقہ کی خارجی مخالفت سے ہوتا ہے۔ انکی طرف سے طعن و تشنیع و تفسیق و تکفیر اُسے چھلاوا بن کر ڈراتی ہے جس سے خائف ہو کر وہ غور و فکر اور تنقید و تحقیق کے "شجرِ ممنوعہ" کے قریب تک جانے کی جرأت نہیں کرتا۔

تحقیق کی ضرورت

لیکن اگر آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ حقیقت وہی ہے جس تک تحقیق و تفتیش کے بعد پہنچا جائے اور ایمان وہی ایمان ہے جو علم و بصیرت اور دلیل و براہان کی رُو سے اختیار کیا جائے تو پھر کسی مسلّمہ کو بھی بلا تحقیق و تنقید تسلیم نہیں کرنا چاہیئے خواہ وہ کتنے ہی زمانے سے متوارث کیوں نہ چلا آ رہا ہو۔ اس ضمن میں نہ اپنی داخلی کشمکش سے گھبرانا چاہیئے اور نہ ہی خارجی مخالفت سے خوف کھانا چاہیئے۔ اسی سلسلہ میں ہم اس وقت ایک ایسے مسلّمہ کو

عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ (غیر شعوری طور پر) یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ آپ کسی مسلمان سے پوچھیے کہ دین کس چیز کا نام ہے وہ بلا تأمل کہہ دے گا کہ دین، قرآن و حدیث کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ بات ہمارے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ اس کے متعلق کسی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس بات کو آپ اس قدر راسخ عقیدہ کے طور پر مانتے اور حتمی و یقینی کے ساتھ پیش کرتے ہیں، کیا آپ نے اسے تحقیق و تدقیق کے بعد مانا اور علم و بصیرت کی بنا پر تسلیم کیا ہے۔ یا اسے محض اس لئے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دے رکھی ہے کہ وہ ہم میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آرہی ہے۔ آیئے ہم اس پر ذرا غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ اس طرح ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔ اگر تحقیق و تدقیق نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ مسلّمہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے، تو پھر ہمارا یہ عقیدہ مبنی علی البصیرت ہو جائے گا، اور اس سے ہمیں جس قدر صحیح اطمینان حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے۔ لیکن اگر ہم علم و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مسلّمہ مبنی علی الحقیقت نہیں تو پھر ہم ایک ایسے عقیدے کو چھوڑ سکیں گے جسے ہم محض رسماً اختیار کئے چلے آرہے ہیں۔ ایسا کرنے میں آپ قرآن کریم کے ایک تاکیدی حکم کی تعمیل کریں گے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت، بصارت اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت۔ سب سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔

اور وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتایا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر جاتے (بلکہ عقل و فکر سے کام لے کر انہیں قبول اور اختیار کرتے ہیں)

دین دین کے متعلق ایک چیز سے تو یقیناً آپ متفق ہوں گے، یعنی یہ کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو، ظنی اور قیاسی نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ

اِلْحَقِّ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۔ (۱۰/۳۶)

اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوا کسی اور چیز کا اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن اور حدیث) کے مجموعے کا نام دین سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں؟ اور کیا یہ دونوں اجزاء اللہ اور اس کے رسولؐ نے دین کی حیثیت سے مسلمانوں کو دیئے ہیں؟ پہلے قرآن کریم کو لیجئے۔ قرآن میں ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب حق ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ ...... (۳۵/۳۱)

جو کچھ ہم نے کتاب سے تیری طرف وحی کیا ہے وہ (بالکل) حق ہے......!

اس کتاب عظیم کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ اس کتاب میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، یہ سراسر حق ہے، یقینی ہے ظنی اور قیاسی نہیں۔ ریب و شکوک کی حدود سے بالاتر ہے۔ یہ تو ہے نفس کتاب کے متعلق۔ اب رہا یہ کہ یہ یقینی شے مسلمانوں کو ملی کیسے اور ان کے پاس رہے گی کس حیثیت سے۔ سو ظاہر ہے کہ قرآن کریم حضورؐ پر نازل ہوا۔ اور اس کے متعلق جمع و تدوین کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷)

یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اور صرف جمع و تدوین ہی نہیں بلکہ اس بات کی ذمہ داری بھی کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل اور کسی نوعیت کی تحریف و الحاق نہ ہو سکے فرمایا!

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس حفاظت کو عملی شکل دینے کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (۵/۶۷)

اے رسولؐ جو کچھ تجھ پر نازل کیا گیا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دو۔

قرآن حضورؐ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل میں جو کچھ کیا وہ آپ کے سامنے ہے یعنی صحابہ کبارؓ کی جماعت کو قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھوا دیا

صحابہؓ ان کا یاد کردہ خود سنتے تھے اور ان کی تصحیح و تصویب فرماتے تھے۔ چنانچہ دنیا سے تشریف لے جانے سے پیشتر حضورؐ نے پورا پورا اطمینان کر لیا کہ پیغامِ خداوندی جو اُن پر نازل ہوا تھا۔ وہ اپنی کامل و مکمل شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ لکھا ہوا بھی محفوظ ہے اور ہزاروں حفاظ کے سینوں میں بھی مصئون حجۃ الوداع کے عدیم النظیر خطبہ میں حضورؐ نے لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے اس امر کا اقرار لیا کہ آپؐ نے اس پیغامِ الٰہی کو ان تک پہنچا دیا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ قرار دیا کہ تو شاہد ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ رسالت ادا کر دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) نے حفاظتِ قرآن کریم کو سب سے بڑا فریضہ سمجھا اور اس کے لئے عملی ذرائع اختیار کئے۔ چنانچہ یہ صحیفۂ ربانی آج تک حفاظ کے سینوں میں اور صفحاتِ قرطاس پر اس انداز سے محفوظ چلا آ رہا ہے کہ اپنے تو اپنے، غیروں تک کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو قرآن کریم موجود ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ نے انہیں دیا تھا۔ اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے اس لئے اس کا یہ آخری پیغام قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ یہ یقینی چیز جس کے دین ہونے میں ظن و قیاس کی کوئی گنجائش نہیں۔

اب اس حصہ کو لیجئے جسے عام طور پر دین کا دوسرا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی مجموعۂ احادیث۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ بھی اسی طرح یقینی ہے جس طرح قرآن کریم ہے۔

حدیث

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا، نہ اُن کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا۔

خدا کے بعد خدا کے رسولؐ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل رہا؟ یہ چیز بھی بڑی غور طلب ہے، اس لئے کہ احادیث، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ جزو دین تھیں تو جس طرح آپؐ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا، زبانی یاد کرایا، لوگوں سے سنا، دُہرایا، اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک حرف محفوظ کر دیا گیا ہے۔ احادیث کے متعلق بھی یہی انتظام فرمانا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ منصبِ رسالت کا یہی تقاضا تھا۔ اور بہ حیثیتِ رسول، حضورؐ کا یہ فریضہ کہ دین کو محفوظ ترین شکل میں اُمت کے پاس چھوڑتے لیکن حضورؐ نے جہاں قرآن کریم کے متعلق اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا، احادیث کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا۔ بر عکس اس کے خود کتب احادیث میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ (صحیح مسلم)

مجھ سے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز نہ لکھو جس نے قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز لکھی ہو اُسے مٹا دے۔

کہا جاتا ہے یہ حکم عارضی تھا۔ اس لئے کہ بعض روایات سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی درخواست پر انہیں اجازت عطا فرما دی تھی کہ وہ چاہیں تو احادیث لکھ لیا کریں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوگا کہ حضورؐ نے اجازت عطا فرمائی تھی، اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق کوئی انتظام نہیں فرمایا تھا۔ پھر، اجازت کے بعد یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے دریافت فرمایا ہو کہ اس نے کون کونسی حدیثیں لکھی ہیں اور اس سے وہ احادیث سنی ہوں، اور ان کی تصحیح یا تصویب فرمائی ہو۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں عربوں کا حافظہ بہت قوی تھا اس لئے ان کی یادداشت پر بھروسہ کر لیا جاتا تھا لیکن اگر دین کے معاملہ میں یادداشت پر بھروسہ کر لینا ہی کافی تھا تو قرآن کریم کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لئے لوگوں کی یادداشت کیوں نہ کافی سمجھی گئی! یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم کا لفظ لفظ یاد کرایا جاتا تھا اور پھر اُن سے سُن لیا جاتا تھا اور اسکی تصدیق فرمائی جاتی تھی۔ اگر کسی نے کچھ احادیث اپنے طور پر یاد بھی کر لی ہوں تو حجت کیلئے وہ سند نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان احادیث کو سن کر اُن کے مستند ہونے کی تصدیق نہ فرما دیتے، اور انہیں ایک کتاب میں محفوظ کر کے اُمت کو نہ دے جاتے اور پھر وہی احادیث قرآنِ کریم کی طرح اپنے اصلی الفاظ میں آگے نہ چلتیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں نہیں ہوئی۔ آپ خیال فرمایئے کہ اگر احادیث بھی دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حفاظت کا کچھ بھی انتظام نہ فرماتے۔

روایات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ کچھ اور متفرق چیزیں بھی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق قلم بند ہوتی تھیں۔ مثلاً وہ تحریری معاہدات، احکام اور فرامین وغیرہ جو آنحضرتؐ نے قبائل یا اپنے عمّال کے نام بھیجے۔ لیکن اس باب میں جو کچھ آج تک معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کی وفات کے وقت صرف حسب ذیل تحریری سرمایہ موجود تھا۔

(۱) پندرہ سو صحابہؓ کے نام (ایک رجسٹر میں)

(۲) مکتوباتِ گرامی جو حضورؐ نے سلاطین و امراء کو لکھے۔

(۳) چند تحریری احکام، فرامین اور معاہدات وغیرہ
(۴) کچھ حدیثیں جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ نے اپنے طور پر قلم بند کیں۔

ان احادیث کے متعلق نہ تو کہیں سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ نے اُن کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی وہ بعد میں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اُمّت کو دیا تھا۔ وہ صرف قرآن تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو نہیں دیا۔ خود بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے (اُمّت کے لئے) کیا چھوڑا ہے، تو آپ نے کہا کہ مَاتَرَكَ اِلَّا مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ۔ یعنی حضورؐ نے قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا۔

(بخاری جلد سوم۔ کتاب فضائل القرآن صفحہ ۱۱۶۷)

صحابہؓ کا عمل

حضور نبی اکرمؐ کے بعد، صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے راشدینؓ کا عمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ مسند امام احمدؒ میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا کہ[1]

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ تب ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوتے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے)۔ پھر فرمایا دستھری کرو۔ خالص رکھو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو (صحابی کہتے ہیں) کہ تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا۔ پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۲۹)

امام ذہبی نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم

---

[1] ہم نے ذیل کی روایات کو مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کی کتاب "تدوین حدیث" سے اقتباس کر کے لکھا ہے تاکہ ان کی صحت کے متعلق کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے۔

اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہوں گے۔ پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔ پھر اگر تم سے کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو۔ اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا، ان کو حرام ٹھہراؤ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی بحوالہ تدوین حدیث صفحہ ۳۲۱)

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابوبکرؓ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا)

جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس نسخہ کو جلا دیا۔ (تدوین حدیث۔ صفحہ ۸۸-۲۸۵)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے، علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے:

حضرت عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جائے تب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوںؓ سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے بھی کہا کہ حدیثیں لکھوا لی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلم بند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی کہ میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۳۹۴)

اور یہ اس لیے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ حدیث کو جمع اور مدوّن نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔ چنانچہ طبقات میں ہے کہ :-

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیئے۔ تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔

(طبقات، جلد ۵ ص ۱۴۱) (تدوین حدیث ص ۳۹۹)

یعنی حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے انہیں جلایا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذرِ آتش کر دیا۔

یہ کچھ دارالخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کے متعلق حافظ ابنِ عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت عمرؓ ابن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلم بند کر لیا جائے۔ مگر پھر ان پہ واضح ہوا کہ قلم بند کرانا ان کا مناسب نہ ہوگا۔ تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو، چاہیئے کہ اسے محو کر دے۔ یعنی ضائع کر دے۔

(جامع بیان العلم، جلد ۱، ص ۶۴) (تدوین حدیث ص ۳۹۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے "قرنِ اوّل میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امر اتفاقی نہیں، بلکہ مبنی بر مصلحت ہے۔" انہوں نے اس سے پہلے امام ابن حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :-

جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک اور عراق سے لے کر شام تک، اور شام سے یمن تک قرآن کے جو نسخے پھیلے ہوتے تھے ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔

(تدوین حدیث ص ۴۱۹)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جب قرآن کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا تھا

یہ ہے کیفیت صحابہؓ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی یعنی ۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔

(۲) صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور لکھی تھیں، انہیں انہوں نے حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدون کردہ مجموعۂ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔

(۴) حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدون نہیں کرنی چاہئیں۔

(۵) حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

(۶) اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوئی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے، اور

(۷) یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا۔ بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں ایسا دیدہ و دانستہ کیا گیا۔

(۰)

مزید شدت

حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابودرداؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ (ان تمام روایات کے لیے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جائے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ قرآنی اور عملِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، نہ

ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔ اسلئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعۂ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا اُن کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآن کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا، خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔

صحیفۂ ہمام ابن منبہ

علمائے حدیث کو بڑی تحقیق و کاوش کے بعد پہلی صدی ہجری کا ایک مجموعۂ احادیث ملا ہے جو صحیفۂ ہمام ابن منبہ کے نام سے متعارف ہے (اس صحیفہ کو چند سال اُدھر، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا) امام ہمام ابن منبہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس صحیفہ میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں جن کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے استاد (حضرت ابوہریرہؓ) کے سامنے لکھا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات سنہ ۵۸ھ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۵۸ھ سے پہلے کا مرتب شدہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام ہمام ابن منبہ ۵۸ھ سے پہلے، مدینہ میں بیٹھ کر احادیث کا مجموعہ مرتب کرتے ہیں اور انہیں صرف ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں۔ اور تیسری صدی ہجری میں جب امام بخاریؒ احادیث جمع کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں چھ لاکھ احادیث مل جاتی ہیں۔ (امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ اور امام یحییٰ ابن معین کو بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں) نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جو احادیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں، انکی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن ان کے شاگرد کے مجموعہ میں کل ۱۳۸ احادیث ہیں۔ بہرحال پہلی صدی ہجری میں انفرادی طور پر احادیث جمع کرنے کی جو کوشش ہوئی اس کا ماحصل صحیفۂ امام ہمام ابن منبہ کی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے کسی تحریری سرمایہ کا سراغ نہیں ملتا۔

امام زہریؒ

اس کے بعد سنہ ۱۰۰ھ کے قریب خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ نے کچھ احادیث اپنے طور پر جمع کرائیں۔ اُن کے بعد امام ابن شہاب زہریؒ (المتوفی سنہ ۱۲۴ھ) نے خلفائے بنی امیہ

کے حکم سے ایک مختصر سا مجموعۂ احادیث تیار کیا جس کے متعلق ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے یہ کام ناگوار گزرا[1] لیکن نہ تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جمع کردہ احادیث کسی مدوّن صحیفہ کی شکل میں موجود ہیں اور نہ امام زہریؒ کا مذکورہ صدر مجموعہ ہی کہیں موجود ہے۔ البتہ بعد کی کتبِ احادیث میں ان کی روایات ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جب لوگوں کو قرونِ اولیٰ کے احوال و کوائف (تاریخ) لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان تصانیف کا مسالہ (MATERIAL) وہ روایات (باتیں) تھیں جو مسلمانوں میں عام طور پر مشہور چلی آتی تھیں۔ بعض حضرات نے اس وسیع موضوع کو سمٹایا اور صرف انہی باتوں کو اکٹھا کیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے مجموعہ کا نام کتبِ احادیث ہے (احادیث کے معنی ہی باتیں ہیں)۔ احادیث کا پہلا مجموعہ جو اس وقت موجود ہے، امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) کی کتاب مؤطا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں مدینہ میں ارکانِ اسلام کے متعلق صحابہؓ کا عمل کیا تھا۔ اس کے مختلف نسخوں میں تین سو سے پانچ سو تک احادیث ملتی ہیں۔ امام مالکؒ کے بعد یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا گیا اور دوسرے ائمۂ علوم کو بھی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس دور میں کئی ایک کتبِ احادیث مدوّن ہوئیں۔ عہدِ عباسی میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی کتبِ احادیث کی نشر و اشاعت نے بھی نمایاں وسعت حاصل کر لی۔ کتبِ احادیث میں سب سے زیادہ مشہور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم) ہیں۔ امام بخاریؒ (المتوفی ۲۵۶ھ) نے قریب چھ لاکھ (۶) احادیث اکٹھی کیں اور ان میں سے کاٹ چھانٹ کر جو مجموعہ تیار کیا اس میں مکررات حذف کر دینے کے بعد دو ہزار چھ سو تیس احادیث ہیں۔ اسی کتاب کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ (یعنی قرآن کے بعد دنیا میں صحیح ترین کتاب) کہا جاتا ہے۔ کتبِ احادیث کے اسی قسم کے مجموعے ہیں جنہیں اب دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں اہلِ سنت والجماعت (سُنّی حضرات) صحیح ترین مانتے ہیں (انہیں صحاح ستہ۔ یعنی حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں کہا جاتا ہے) واضح رہے کہ شیعہ حضرات کے احادیث کے اپنے مجموعے ہیں[2]۔ وہ سُنیوں کے مجموعوں کو صحیح نہیں مانتے۔ نہ ہی

---

[1] مختصر جامع بیان العلم۔

[2] شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) الکافی :- جامع ابوجعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں ان کی وفات ۳۲۸ھ میں ہوئی۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان کے مجموعوں کو قابلِ سند تسلیم کرتے ہیں۔

صحاحِ ستہ یہ ہیں :-

(۱) صحیح بخاری

(۲) صحیح مسلم

(۳) ترمذی

(۴) ابوداؤد

(۵) ابن ماجہ

(۶) نسائی

ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے بخاری کو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ۔ ان مجموعوں کے جامعین کے مختصر تعارف حسب ذیل ہیں :-

(۱) امام بخاریؒ :- یہ بخارا میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ (یا بعض کے نزدیک ۲۶۰ھ) میں سمرقند کے قریب فوت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھر کر چھ لاکھ کے قریب احادیث جمع کیں۔ ان میں سے انہوں نے اپنے معیار کے مطابق صرف قریب (۷۲۰۰) احادیث کو صحیح پایا اور انہیں اپنی کتاب میں درج کرلیا۔ (باقی قریب پانچ لاکھ ترانوے ہزار کو مسترد کردیا)۔ ان (۷۲۰۰) میں سے بہت سی احادیث مختلف ابواب میں مکرر نقل ہوئی ہیں۔ اگر ان مکررات کو شمار نہ کیا جائے تو باقی (۲۷۶۲) رہ جاتی ہیں (یا ۲۶۳۰)۔

(۲) امام مسلمؒ :- صحیح مسلم کے جامع امام مسلم بن حجاج تھے جو ایران کے مشہور نیشاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں اور وفات ۲۶۱ھ میں ہوئی۔

---

(۲) من لایحضرہ الفقیہ :- یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی ۳۸۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۳) تہذیب :- مؤلفہ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن۔ متوفی ۴۶۰ھ۔

(۴) استبصار :- یہ بھی انہی کی تالیف ہے۔

ان میں سے بھی کوئی عرب نہیں۔

(۳) ترمذی :- امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی - یہ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔ سال ولادت ۲۰۹ھ اور وفات ۲۷۹ھ ہے۔

(۴) ابو داؤد :- سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں وفات پا گئے۔

(۵) ابن ماجہ :- ابو عبداللہ محمد بن زید ابن ماجہ - یہ شمالی ایران کے شہر قزوین کے رہنے والے تھے۔ سن پیدائش ۲۰۹ھ اور رحلت کا سن ۲۷۳ھ ہے۔

(۶) امام عبدالرحمٰن نسائی :- یہ مشرقی ایران کے صوبہ خراسان کے ایک گاؤں نسا میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات ۳۰۳ھ ہے۔

ان ائمہ حدیث کے اس مختصر سے تعارف سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں :-

(۱) یہ سب کے سب ایرانی تھے :- ان میں عرب کا رہنے والا کوئی نہیں تھا۔ مقام حیرت ہے کہ عربوں میں سے کسی نے بھی اس عظیم کام کا بیڑہ نہ اٹھایا۔ اور احادیث کی جمع و تدوین کا کام غیر عربوں (عجمیوں) کے ہاتھوں سرانجام پایا۔

(۲) یہ تمام حضرات تیسری صدی ہجری میں ہوئے۔

(۳) انہوں نے لاکھوں حدیثیں پائیں لیکن ان میں سے بہت تھوڑی ایسی تھیں جنہیں انہوں نے صحیح قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا۔

(۴) یہ تمام احادیث، لوگوں نے انہیں زبانی سنائیں - ان کا کوئی تحریری ریکارڈ اس سے پہلے کا موجود نہیں تھا۔

(۵) ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلہ کا نتیجہ تھا۔ ان احادیث کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی (یعنی خدا نے انہیں بذریعہ وحی نہیں بتایا تھا کہ فلاں حدیث صحیح ہے، اسے رکھ لو، اور فلاں غلط ہے اسے مسترد کر دو) نہ ہی اس کی کوئی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی (کہ تم نے جن احادیث کا انتخاب کیا ہے وہ فی الحقیقت میرے اقوال ہیں) نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ تھا جس سے انہوں نے ان احادیث کا انتخاب کر لیا ہو۔ لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنی فراست کے مطابق، صحیح تصور

کر کے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا تھا

اب آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی انفرادی کوششوں کے نتیجے کے متعلق کسی طرح بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئیے کہ اس دو ڈھائی سو سال کے عرصہ میں جو باتیں لوگوں کی زبانی آگے منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے جو اسی طرح باپ سے بیٹے یا استاد سے شاگرد نے سُن کر حفظ کر لئے تھے ان باتوں کو ہر راوی اپنے الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)

کتنی حدیثوں کو رد کر دیا

ضمناً، یہ بھی دیکھئے کہ ان حضرات کو کس قدر احادیث ملیں اور ان میں سے انہوں نے کتنی احادیث کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں داخل کیا۔

(۱) امام بخاری۔ چھ لاکھ میں سے مکررات نکال کر صرف	۲۷٦۲ یا ۲٦۳۰
(۲) امام مسلم۔ تین لاکھ میں سے صرف	۴۳۴۸
(۳) ترمذی۔ تین لاکھ میں سے صرف	۳۱۱۵
(۴) ابو داؤد۔ پانچ لاکھ میں سے صرف	۴۸۰۰
(۵) ابن ماجہ۔ چار لاکھ میں سے صرف	۴۰۰۰
(٦) نسائی۔ دو لاکھ میں سے صرف	۴۳۲۱

ظاہر ہے جب ردّ و قبول کا مدار جامع احادیث کی ذاتی بصیرت ہو، تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان لاکھوں کے نیز میں جنہیں ان حضرات نے مسترد قرار دے دیا تھا، کتنی صحیح حدیثیں بھی ضائع ہو گئی ہوں گی۔ باقی رہا یہ کہ جن احادیث کا ان حضرات نے انتخاب کیا، ان میں کتنی حدیثیں آگئیں جنہیں کسی صورت میں بھی حضور نبی اکرمؐ کے اقوال یا افعال نہیں قرار دیا جا سکتا، اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

(۰)

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ جمع احادیث کی یہ سب کوششیں ان حضرات کی انفرادی تھیں جنہیں خدا اور رسولؐ کی سند حاصل نہیں تھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر آپ خیال فرمائیے کہ کیا دین بھی ایسی چیز ہے

جیسے اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں لوگوں کی انفرادی کوششوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ امام بخاریؒ اور دیگر حضرات نے اُن باتوں کو یک جا جمع کر دیا جو اُس زمانہ میں عام طور پر مشہور تھیں ورنہ جس طرح ان سے پہلے اس قسم کی کوئی کتابیں مرتب نہیں ہوئی تھیں، اگر یہ حضرات بھی اس کی کوشش نہ کرتے تو "دین کا آدھا حصہ" (معاذ اللہ) بالکل کھو چکا تھا[1] آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ وہ خدا جو دین کے مکمل ہونے کا اعلان قرآن کریم میں بالتصریح فرما دے اور وہ رسول گرامیؐ جن کے بعد قیامت تک کسی اور رسول نے نہ آنا ہو، وہ دین کے ایک ایسے اہم حصہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے؟ ایسا تصور میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

ایک دوسری صورت بھی تھی جس طرح قرآن کریم محفوظ کیا گیا تھا۔ اگر لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے الفاظ یاد کر لیتے اور وہی الفاظ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے تاآنکہ وہ کتابی شکل میں لکھ لئے جاتے تو بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ کتبِ احادیث کا مجموعہ ایک حد تک یقینی ہے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں تھی۔ احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ (بخاری اور مسلم سمیت) ان کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں۔ یہ احادیث روایات بالمعنیٰ ہیں۔ یعنی ان کا انداز یہ ہے کہ مثلاً ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سُنا۔ اس نے اُس سے جو کچھ سمجھا، اپنے الفاظ میں کسی دوسرے سے بیان کیا۔ اُس نے جو کچھ اخذ کیا اسے آگے منتقل کیا۔ اب ذرا تصور میں لائیے اس صورتِ حالات کو کہ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بلکہ دو اڑھائی سو سال تک یونہی جاری ہے اور اس کے بعد لوگوں میں اس طرح پھیلی ہوئی باتوں کو یکجا جمع کیا جائے تو ان باتوں کو، پہلے کہنے والے (یعنی نبی اکرمؐ) کے بیان فرمودہ مفہوم سے جس قدر تعلق ہوگا وہ ظاہر ہے۔ آپ ایک کمرے میں دس آدمیوں کو بٹھا کر ایک کے کان میں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کیجئے، اس کے بعد یہ بات کانوں کان منتقل ہوتی ہوئی جب پھر آپ تک پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس میں، اور جو کچھ آپ دسویں آدمی سے سُن رہے ہیں، اس میں کس قدر فرق ہوتا ہے، اور جب یہ سلسلہ اڑھائی سو سال تک جاری رہے اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے یہ باتیں آگے منتقل ہوئی

روایات بالمعنیٰ

---

[1] "آدھا حصہ" ہی نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین کا ۹/۱۰ حصہ احادیث میں ہے اور صرف ۱/۱۰ حصہ قرآن میں۔

...گی ۔ تو ان میں جو اصلیت باقی رہ جائے گی وہ ظاہر ہے ۔

مفہوم سمجھنے میں غلطی

اس ضمن میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تنقید قابلِ غور ہے ۔ جہاں تک نبی اکرمؐ کے ارشادات گرامی کے صحیح مفہوم سمجھنے کا تعلق ہے ، وہ (بعد کے راوی تو ایک طرف) حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق (بخاری کی ایک حدیث پر تنقید کرتے ہوئے) لکھتے ہیں :-

> ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبیؐ کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات نہیں سن سکے ۔ . . . . . اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں بعض کو بعض روایات نے صاف کر دیا ہے اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں ۔ زبانی روایات میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ (تسلیم ۔ احادیث نمبر ۔ مورخہ ۱۴ ۹۵ہ)

یہ تو رہا حدیث کے سب سے پہلے راوی کی مفہوم فہمی کے متعلق ۔ جہاں تک مفہوم کو آگے منتقل کرنے کا تعلق ہے ، وہ اپنی کتاب تفہیمات حصہ اول میں لکھتے ہیں ۔

> مثال کے طور پر میں آج ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا ۔ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا ۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی کو ۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بہ لفظ نقل کرے گا کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے ، اپنے الفاظ میں بیان کرے گا کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا ۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بہ لفظ نقل کر دے گا ۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل در روایت میں غلطیاں کرے گا ۔ (صفحہ ۳۲۹ – ۳۳۰)

اقوال منسوب الی الرسولؐ

یہ تھا وہ طریقہ جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دو ڈھائی سو سال بعد ، احادیث کے مجموعے مرتب

ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ قرآنی آیت پڑھتے ہیں تو پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قال اللہ تعالیٰ" یعنی "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔" اور جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو اس کے شروع میں کہتے ہیں "قال الرسولؐ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اور آخر میں کہتے ہیں۔ "او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی یوں، یا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ احادیث کو اقوالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا جاتا، بلکہ اقوال منسوب الی الرسولؐ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو احادیث جمع کرنے والوں کے زمانے میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

(۰)

اسماء الرّجال

ظاہر ہے کہ اس طرح احادیث کی روایت میں ایک ایک حدیث میں کتنے ہی راوی آتے ہیں۔ جب احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جن راویوں کا ذکر احادیث میں آتا ہے، ان کے متعلق تحقیق کیا جانا چاہیئے کہ وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں۔ جب اس طرح ان راویوں کے متعلق طے کر لیا جائے تو پھر ایک ایک حدیث کو لے کر دیکھا جائے کہ اس کے راوی کس قسم کے ہیں۔ جرح و تعدیل اور اسماء الرّجال کا یہ وہ فن ہے جس کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فن کے ائمہ نے بڑی محنت سے کام لیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح آپ کسی طرح بھی یقین کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں؟ آپ نے جس آدمی سے کوئی بات سنی ہو اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ لیکن اگر اُس بات کے بیان کرنے میں گذشتہ دو اڑھائی سو برس میں گزرے ہوئے پانچ سات آدمیوں کا ذکر ہو تو آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ وہ قابلِ اعتماد تھے یا نہیں، اور پھر یہاں سوال صرف قابلِ اعتماد ہونے کا ہی نہیں، اس امر کا یقین ہونا بھی ضروری ہے کہ وہ اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور سمجھنے کے بعد اس کا صحیح صحیح مفہوم اپنے الفاظ میں آگے منتقل کر دیں۔ کہئے کہ یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ آپ گذشتہ دو اڑھائی سو سال میں گزرے ہوئے آدمیوں کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ یہ کچھ کہہ سکیں؟ یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> یہ لوگ (یعنی حدیث کو دین ماننے والے) محدثینؒ کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دو دھڑکا دہ دھڑکا پانی کا پانی

الگ کر کے دکھ دیا ہے۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیتے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار و حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں۔ محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں، بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہر حال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں، وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ (تفہیمات۔ حصہ اول صفحہ ۳۱۸)

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

محدثین کرامؒ نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا۔ جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کون سی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔ (صفحہ ۲۱۹)

غلطیاں بھی محض سہو و خطا کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ

نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جاتا تھے، یہ امکان محض امکان عقلی نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے۔ (صفحہ ۲۱۹)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوتی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ، اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو، وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔ (صفحہ ۲۲۱)

پھر فرماتے ہیں :-

ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے۔ مگر لازم نہیں کہ روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت منقطع ہو...... یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ صفحہ ۳۲۱-۳۲۲

ثقاہت کا فیصلہ

جہاں تک ذاتی رجحان کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ وہ ثقہ تھا یا نہیں تو یہ فیصلہ کتنا ہی بے لاگ کیوں نہ ہو اس میں عام طور پر رجحاناتِ قلبی کا شائبہ آ جائے گا اور قلبی رجحانات میں عقیدے کو بڑا دخل ہوتا ہے امام بخاریؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ کو ثقہ نہیں قرار دیتے پھر یہیں تک بس نہیں چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے اس لیے تمام کوفہ والے غیر معتبر، ناقابل روایتِ حدیث قرار پا گئے۔ اور کوفہ چونکہ عراق میں ہے اس لیے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے۔ اور فیصلہ کر دیا گیا کہ عراق والوں کی سو حدیثوں میں سے ننانوے ۹۹ چھوڑ دو۔ جو ایک لو تو اُسے بھی مشتبہ ہی سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدے کے اختلاف کی بنا پر دو جلیل القدر امام، یعنی امام ابوزرعہ اور امام ابوحاتمؒ نے خود امام بخاری کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے اور ان سے روایت ترک کر دی ہے۔ بخاری اور مسلم کی کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ امام بخاریؒ کو **مختل الحدیث** قرار دیتے ہیں۔ ان ائمہ علوم کی اس قسم کی باہمی چشمک کی بے شمار مثالیں کتب روایات میں ملتی ہیں۔ عقائد کے اختلافات سے حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے اختلاف کا سب سے بڑا مظاہرہ سنی اور شیعہ فرقوں کا وجود ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سنی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلۂ روایت تابعینؒ و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس سے بہت مختلف تعلیم احادیث کے ان مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں۔ ان کا سلسلۂ روایت بھی ائمہ

تابعین و صحابہؓ تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سنّی حضرات) تو یہ تصوّر میں بھی نہیں لا سکتے کہ وہ بزرگانِ دین جو اُن احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں داخل ہیں، وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ اور معتبر ماننا پڑے گا۔ اب صورتِ معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث اُمّت کو ملیں جو سنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ کے ہاں صحیح ہیں، اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض۔ اب کہیئے کہ کونسی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرار دی جائے اور اسے جزوِ دین سمجھا جائے۔ اور کون سی غلط۔ اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ اربابِ جرح و تعدیل یا جامعینِ احادیث کا ہم مسلک بھی ہو تو یہ صاف پارٹی بازی ہے، انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو، اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہوں۔ ایک چیز اور بھی دلچسپ ہے۔ خود امام بخاریؒ (اور دوسرے جامعینِ احادیث) جن بزرگوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات مردود ٹھہراتے ہیں۔ خود ان کی ہی روایات سے اپنے مجموعوں میں احادیث، درج کر دیتے ہیں۔ (دیکھئے میزان الاعتدال از علامہ ذہبی و تدریب الراوی وغیرہ)۔

یہ تو میں خارجی شہادات جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احادیث نہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جزوِ دین تھیں نہ صحابہ کبارؓ نے انہیں ایسا سمجھا اور احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں وہ رسول اکرمؐ کے الفاظ بھی نہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر داخلی شہادت خود ان مجموعوں کے مشمولات (CONTENTS) ہیں۔ ان میں کس کس قسم کی باتیں لکھی ہیں ان کے ذکر سے روح کانپتی ہے، ہاتھ میں قلم لرزتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا یہ بیان آپ کو بے حد تعجب انگیز اور حیرت ناک معلوم ہوگا اور ہونا بھی چاہیئے۔ اس لیے کہ ہمارے دلوں میں ان مجموعوں کی عزت و عظمت قرآنِ کریم کے درجہ تک کی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق ایسی بات یقیناً تحیّر انگیز ہوگی لیکن ہم آپ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ نہ ہماری سنیئے نہ کسی اور کی، بلکہ صحیح بخاری لے کر خود مطالعہ کیجیئے اور پھر دیکھئے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ سے کہا جائے گا کہ ذرا سوچئے تو سہی امام بخاری علیہ الرحمۃ اتنے پائے کے امام، پھر ان کے بعد ایک ہزار سال کے عرصے میں کتنے بڑے جلیل القدر علماء عظام و بزرگان کرام ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو

داخلی شہادت

اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ دیا ہے، کہتے ایسی کتاب میں (پناہ بخدا) اس قسم کی بات ہو سکتی ہے۔

اس کے جواب میں ہم پھر یہی عرض کریں گے کہ ان بزرگان سلف (علیہم الرحمۃ) کی عزت و توقیر بجا اور درست۔ لیکن جب ہمارے پاس بخاری شریف موجود ہے تو ہم اسے کیوں نہ ایک نظر دیکھ لیں۔ آجکل تو بخاری شریف کا اردو ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔ آپ عربی نہیں جانتے تو اردو ترجمے ہی کو دیکھ لیں اور اس کے بعد خود فیصلہ فرمائیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ آپ کو اس میں ایسی باتیں ملیں گی جنہیں آپ کبھی جناب نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جو انسانیت کے معراجِ کبریٰ کا مظہرِ اتم تھی۔ وہ ہستی گرامی مرتبت (فداہ ابی و امی) جو علم و بصیرت کے افقِ اعلیٰ پر جلوہ افروز تھی۔ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ اس فخرِ موجودات، رحمۃ للعالمینؐ کی ذاتِ عظمت مآب کی طرف کس کس قسم کی باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے جو سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو کہنا پڑا کہ

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) بخاری کی اس حدیث پر تنقید کرتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا، لکھتے ہیں۔

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لیے یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ روایت اللہ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔ (ترجمان القرآن، جلد دوم صفحہ ۱۴۹-۵۰)

حتیٰ کہ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں ایک نو مسلم یورپین کو بخاری کی حدیث پڑھا ہی نہیں سکتا۔[1]

---

[1] حوالہ ان کے اس مقالہ میں آئے گا جو اسی کتاب میں آگے جا کر درج کیا گیا ہے۔ (رسالہ الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۲۹۵)

یہ افراد کی تنقید ہے۔ پوری کی پوری حنفی جماعت، بخاری اور مسلم کی قریب دو صد احادیث کو صحیح نہیں سمجھتی۔

(۰)

کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعے ظنی ہی سہی لیکن دنیا میں کتنی ظنی باتیں ہیں جنہیں ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں اور ہمارا روزمرہ کاروبار ہی اس بات پر چلتا ہے۔ دیکھئے آپ تاریخ کے واقعات کو مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی ظنی ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات میں خبریں پڑھتے ہیں حالانکہ وہ بھی یقینی نہیں ہوتیں۔ پھر احادیث سے کیا چڑ ہے کہ آپ انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ ظنی ہیں۔

یہ دلیل بظاہر معقول نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے بعد کہ ان دونوں باتوں میں فرق کتنا بڑا ہے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تاریخ یا اخبارات ہمارے لیے دین کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا جی چاہے تو ایک واقعہ کو صحیح تسلیم کر لوں اور اگر اس کے خلاف میرے پاس دلائل ہوں تو یہ کہہ کر رد کر دوں کہ مجھے اس کی صحت پر شبہ ہے۔ برعکس اس کے احادیث ہمارے لیے دین قرار دی جاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید سے بالاتر ہیں۔ اگر مجھے ان کے متعلق ذرا سا بھی تردد پیدا ہو جائے تو ایمان کی خیر نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ مثلاً تاریخ میں لکھا ہو کہ فلاں بادشاہ نے فلاں مقام پر جھوٹ سے کام لیا۔ میں چاہوں تو اُسے صحیح تسلیم کروں اور چاہوں تو مسترد کر دوں۔ نہ مجھ پر اس باب میں کوئی پابندی عاید ہوتی ہے، نہ اس سے میرے ایمان پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ لیکن جب بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آئے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا" تو چونکہ حدیث کو جزوِ دین قرار دے دیا گیا ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا مجھ پر لازم ہو گیا۔ اگر صحیح تسلیم نہیں کرتا تو حدیث کے متعلق شک کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوتا ہوں۔ اور اگر اس کی صحت پر ایمان لاتا ہوں تو خدا کے ایک برگزیدہ نبیؑ کو (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ یا مثلاً اخبار میں آپ دیکھتے ہیں کہ فلاں شہر میں کسی شخص نے ایک دوسرے شخص کی ناک کاٹ ڈالی، تو اسے ماننا نہ ماننا آپ کے ایمان کا جزو نہیں۔ لیکن جب آپ بخاری شریف کی اس حدیث کو پڑھیں گے کہ "جب ملک الموت حضرت موسیٰؑ کی روح قبض کرنے کے لیے آئے تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے ایک ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی"۔ تو آپ کو اس واقعہ کو صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اس میں شک کرنے سے آپ دین میں شک کر رہے ہیں۔ اس سے آپ پر واضح ہو گیا کہ دنیا کی

دین ظنی نہیں ہو سکتا

دوسری ظنی چیزوں کے تسلیم کرنے میں اور ایک ایسی ظنی چیز کے تسلیم کرنے میں جسے آپ نے دین کا جزو قرار دیا گیا ہو، کتنا بڑا فرق ہے۔

اس کا نتیجہ

حدیث کے ظنی ہونے کا عملی نتیجہ کیا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ جب ہم کسی معاملہ کے متعلق قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کریں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کے ترجمہ میں اختلاف کرے، اس کے مفہوم میں اختلاف کرے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہے گا کہ معلوم نہیں یہ قرآن کی آیت ہے بھی یا نہیں۔ لیکن حدیث کی صورت میں سب سے پہلا سوال یہ زیر بحث آئے گا، کہ یہ قولِ رسولؐ ہے بھی یا نہیں۔ اس ضمن میں مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۹۰)

(۰)

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ کسی بات کو دین قرار دینے کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ اس بات کا یقینی ہونا مسلّم ہو۔ جب یہ دعویٰ کیا جائے کہ دین، قرآن اور حدیث دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، تو ضروری ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک یقینی ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے تو اس آیتِ قرآنی کے کلام اللہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کا یقینی طور پر دین ہونا مسلم ہے۔ اس کے برعکس، حدیث کی یہ کیفیت ہے کہ جب کسی حدیث کو پیش کیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حدیث قولِ رسولؐ ہے بھی یا نہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جس قدر جھگڑے ہیں وہ اسی بات سے ہیں۔ ایک فرقہ اپنے کسی عقیدہ یا مسلک کو دین کہہ کر پیش کرتا ہے اور اس کی تائید میں کوئی حدیث پیش کرتا ہے۔ تو دوسرا فرقہ اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ حدیث قولِ رسولؐ ہے ہی نہیں۔ یہ جھگڑے ہزار برس سے مسلسل چلے آ رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے مٹنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اس لیے کہ آج ساری اُمت کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے یہ یقینی طور پر متحقق ہو سکے کہ فلاں حدیث فی الواقعہ رسول کریمؐ کا فرمان ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق یہ کوئی نہیں کہے گا کہ یہ ہے تو قرآن کی آیت لیکن ضعیف

ضعیف اور قوی

ہے۔ قوی نہیں۔ قرآن کی ہر آیت قوی ہے۔ اس میں ضعیف اور قوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی حدیث پیش کی جائے تو فریقِ مقابل اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیتا ہے، کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ چونکہ حدیثوں کی کئی قسمیں ہیں، اور مختلف فرقوں کے باہمی اختلاف اکثر و بیشتر حدیثوں کے اسی اختلاف کی بنا پر چلے آ رہے ہیں، ان کے مٹنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔

مزاج شناس رسول صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن ایسا نہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ان اختلافات کے مٹنے کی صورت موجود ہے۔ کیونکہ ایک ایسا معیار موجود ہے جس کی رو سے حتم و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے یا نہیں یہاں تک ہی نہیں۔ یہ بھی کہ اگر کسی معاملہ کے متعلق کسی مجموعہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی یقین کے ساتھ بتایا جا سکتا ہے کہ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے۔ آپ حیران ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو تیرہ چودہ سو سال بعد وہ کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے یہ باتیں اس حتم و یقین کے ساتھ معلوم ہو سکیں۔ آپ سنئے کہ وہ ذریعہ کونسا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ :-

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت، کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے، وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کونسا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔

یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیئے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے ڈھانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لیتا ہے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ مینے بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات، جلد اول ۳۲۳ - ۳۲۴)

آپ نے غور کیا کہ بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ۔

(۱) یا تو آپ امام بخاری و مسلم (اور دیگر ائمہ احادیث) پر ایمان لائیے ـــــ "ایمان لائیے" کے الفاظ یونہی نہیں لکھ دیئے گئے۔ آپ کو سچ مچ اس بات پر ایمان لانا ہوگا کہ جس بات کو ان جامعینِ حدیث نے کہہ دیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ منکرِ حدیث، فلہٰذا، دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

(۲) اور اگر آپ جامعینِ احادیث پر ایمان نہیں لاتے تو آپ کو اپنے زمانے کے کسی مزاج شناسِ رسولؐ کی نگہِ بصیرت پر ایمان لانا ہوگا۔ یعنی یہ ماننا پڑے گا کہ جس بات کے متعلق وہ کہہ دے کہ وہ ارشادِ نبویؐ ہے (خواہ وہ بات کسی مجموعۂ احادیث میں موجود ہو یا اس آسمان کے نیچے کہیں بھی موجود نہ ہو) آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ منکرِ حدیث، فلہٰذا، مرتد اور کافر ہیں۔

(۳) بلکہ یوں کہ اگر آپ جامعینِ احادیث کی نگہِ انتخاب پر ایمان لاتے ہیں اور مزاج شناسِ رسولؐ

کی نگہ بصیرت پر ایمان نہیں لاتے تو آپ مزاج شناسِ رسولؐ کے نزدیک منکرِ حدیث، لہٰذا، کافر ہیں اور اگر آپ مزاج شناسِ رسولؐ کی نگہ بصیرت پر ایمان لاتے ہیں اور اس طرح بخاری یا مسلم کی کسی حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتے ہیں تو آپ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک منکرِ حدیث، لہٰذا کافر ہیں۔

یعنی خدا نے تو آپ کو (مسلمان ہونے کے لیے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کہا تھا لیکن اب صورت یہ ہے کہ جب تک آپ ان انسانوں پر ایمان نہیں لائیں گے آپ مسلمان نہیں کہلا سکیں گے۔

اِنَّا لِلّٰہِ و اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

حدیث کے متعلق عقیدہ

یہ تو ہے حدیث کی پوزیشن۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے متعلق ہمارے ہاں عقیدہ کیا چلا آ رہا ہے؟ اسے ذرا غور سے سنیئے۔ اور پھر سوچئے کہ اس قسم کی ظنی چیز کے متعلق اس قسم کے عقائد دین میں غلو نہیں تو اور کیا ہے؟ مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہلِ حدیث) اپنے رسالہ "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں لکھتے ہیں:۔

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا، ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا.....
> جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مطابق۔ (ص ۴۸)

یعنی جو احادیث فرقۂ اہلِ حدیث کے نزدیک صحیح ہیں ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار (یعنی یہ کہنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہے) کفر ہے اور ایسا کہنے والا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک بخاری اور مسلم، صحیحین ہیں اس لیے ان کی کسی حدیث کا انکار کفر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> بخاری اور مسلم کی احادیث پر امت متفق ہے..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ص ۵۵)

"اُمت" سے مراد ہے فرقہ اہلِ حدیث۔ کیونکہ (اور تو اور) حنفی حضرات (جو اُمت کی اکثریت کا فرقہ ہے) بخاری اور مسلم کی کتابوں کم و بیش دو سو احادیث کو صحیح نہیں مانتے۔

ان احادیث کا انکار کفر کیوں ہے؟ اس کے متعلق مولانا اسماعیل مرحوم فرماتے ہیں۔

حدیث بھی وحی ہے

جبریل، قرآن اور سُنّت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سُنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ ص ۶۰

یعنی قرآن اور حدیث دونوں وحیٔ خداوندی ہیں اور دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اس کے لیے ایک روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر قرآن بھی نازل ہوتا ہے اور مثلہٗ معہٗ (اس کے ساتھ اس جیسی) ایک اور چیز (حدیث بھی)۔ ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔

وحی کی دو قسمیں

وحیٔ جلی (قرآن) اور وحیٔ خفی (حدیث)۔ وحیٔ جلی کو وحیٔ متلو بھی کہتے ہیں (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور وحیٔ خفی کو وحیٔ غیر متلو (یعنی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے)

واضح رہے کہ وحی کی ان دو قسموں کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں حتیٰ کہ حدیث کے اوّلین لٹریچر میں بھی اس اصطلاح کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شب کتب (جو لکھی جائے) اور دوسری قسم شفاہ (جو لکھی نہ جائے، روایۃً آگے منتقل ہو) ان حضرات نے اس عقیدہ کو یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا، اور اسے عین دین بنا کر پیش کر دیا۔ ہم اس مقام پر اس بحث کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ عقیدہ کس طرح قرآنِ کریم کی ضد ہے اور اس سے کس طرح دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے۔ ہم صرف پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر حدیث بھی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل" خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی تو وحی کی حفاظت کا ذمہ تو خود خدا نے لیا تھا۔ اس وحی (یعنی حدیث) کو خدا نے محفوظ کیوں نہ رکھا (جیسا کہ پہلے ہم دیکھ چکے ہیں) اسے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محفوظ کر کے اُمت کو دیا۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے اسے منضبط اور محفوظ کیا۔ نہ صحابہؓ میں سے کوئی اور اسے ضبطِ تحریر میں لایا۔ جس نے اپنے طور پر کچھ لکھا تھا اسے بھی جلا، یا جلوا دیا۔ اگر حدیث اور قرآن دونوں وحی تھے تو وحی کے ایک حصہ (قرآن) کی حفاظت کا وہ اہتمام اور اس کے دوسرے

حدیثیں کیوں نہ لکھی گئیں

حصہ (حدیث) سے یہ بے اعتنائی بلکہ مخالفت؟ کیا یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آسکتی ہے؟ ضمناً اس اعتراض کا جواب بھی سن لیجیے کہ

...دی تھی تو اسے قرآن کے اندر شامل کیوں نہ کر دیا گیا۔ مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں

...نہ کیا ایسا کر دیا جاتا تو

...س سے قرآن مجید کم از کم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے برابر ضخیم ہو جاتا۔

(تفہیمات۔ حصہ اول ص ۲۳۶)

...تی جو اس طرح قرآن کی ضخامت بہت بڑھ جاتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ وحی کے اس ...حصہ کو قرآن میں شامل کر دیا جاتے۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ بہت اچھا۔ قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کے خدشہ ...کی وجہ سے اسے قرآن میں شامل نہ کیا جاتے تو اسے ایک علیحدہ جلد میں کیوں نہ لکھ لیا گیا۔ تو اس کے متعلق فرمایا کہ

...س کی وجہ یہ ہے کہ

اُس وقت لکھنے پڑھنے والے کم تھے اور سامانِ کتابت اور بھی زیادہ کمیاب تھا۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مارچ ۱۹۵۴ء)

یہ جواب مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (جو آج پیرس میں مقیم ہیں) اس کی وجہ کچھ اور بتاتے ہیں وہ اپنے ایک مقالہ میں (جو کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ الاسلام کی یکم و پندرہ جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں۔

> نبی اکرمؐ بہ حیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) واقعہ ہوئے تھے۔ بہ حیثیت رسولِ خدا انہوں نے اس امر کے لیئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لیئے تھے کہ خدا کا پیغام، یعنی قرآن، نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جاتے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جاتے۔ اگر وہ اپنے اقوال کی حفاظت کے لیے بھی اس قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ اسے انانیت پر محمول کرتے۔ اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے۔

یہ ہے اس "وحی" کی کہانی جو قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل قرار دی جاتی ہے جسے جبریلؑ اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کریم کو اور جس کے انکار سے اسی طرح کفر لازم آتا ہے جس طرح قرآن کے انکار سے۔ یا للعجب!

(•)

حدیث، قرآن سے اونچی ہے

یہاں تک تو ہم نے دیکھا ہے کہ اتنا ہی کہا جا رہا ہے کہ حدیث، قرآن کی مثل ہے۔ یعنی دونوں ہم پایہ

ہیں۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام اوزاعی کا قول ہے کہ

قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں [1]۔

یعنی اگر قرآن اور حدیث باہم دگر متعارض ہوں تو جو فیصلہ حدیث دے اُسے قبول کرنا چاہیئے نہ کہ اس فیصلہ کو جو قرآن دے۔

حدیث، قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے

اتنا ہی نہیں، ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ کرسکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں۔

نبی کے قول کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو، تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے ..... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَ نِ الْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ۔ (۲/۱۸۰) "تمہارے اوپر والدین کے لیے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ۔ وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے، یعنی وارث کے لیے وصیت ناجائز قرار دی گئی، حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۸۵)

جو لوگ اس قدر متشدد نہیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث درحقیقت قرآن کے احکام کی تشریح اور تفسیر بیان کرتی ہے۔ اس میں قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل ملتی ہے۔ لیکن یہ لوگ محض اعتراض کا جواب دینے کیلئے

حدیث مستقل دین ہے

ایسا کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ یہ جب حدیث کو، قرآن کی مثل قرار دیتے ہیں تو اس سے جو لازمی نتیجہ نکلتا ہے اس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ حدیث کو قرآن کی تفسیر نہیں مانتے بلکہ قرآن کی طرح مستقل دین مانتے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳

...ب میں لکھتے ہیں۔ (یعنی وہی مودودی صاحب جن کی حدیث پر تنقید ہم پہلے دیکھ چکے ہیں)

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے یعنی وہ انہی مسائل و فرائض کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے...... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت جولائی۔ اگست ستمبر ۱۹۵۸ء)

آپ نے غور فرمایا کہ حدیث کے متعلق عقیدہ کیا ہے۔ یہ کہ

(۱) حدیث اور قرآن دونوں خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔

(۲) حدیث قرآن کے ساتھ اس کی مثل ہے۔

(۳) حدیث قرآن کی اتنی محتاج نہیں جتنا قرآن حدیث کا محتاج ہے۔

(۴) حدیث قرآن پر قاضی ہے۔

(۵) یہ قرآن کی مفسر اور شارح نہیں بلکہ دین کے احکام میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

(۶) حدیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہے۔

اور

(۷) جو شخص ایسا عقیدہ نہ رکھے وہ منکرِ حدیث، فلہٰذا، کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

—— (۰) ——

قرآن کی تفسیر

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ آپ نے اُسے صحابہؓ کو سمجھایا۔ لہٰذا قرآن کی جو تفسیر حضورؐ نے بیان فرمائی تھی۔ اس سے بہتر تفسیر اور کس کی ہوسکتی ہے؟ اس لیے اگر کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کا مطلب اس سے مختلف لیتا ہے جو مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا تو اس کا مطلب صحیح نہیں ہوسکتا۔

یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے۔ اس میں کسے کلام ہوسکتا ہے کہ قرآن کا جو مطلب نبی اکرمؐ نے فرمایا وہی صحیح ہوسکتا ہے۔ اس سے مختلف مطلب صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کی جو تفسیر احادیث میں بیان ہوئی ہے کیا وہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہے؟ اس سلسلہ میں پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ پورے

قرآن کی تفسیر احادیث میں بیان ہی نہیں ہوئی، اس کی بہت تھوڑی سی آیات کی تفسیر بیان ہوئی ہے۔ بخاری میں تفسیر کا صرف ایک باب ہے اور اس میں چند جستہ جستہ آیات کی تشریح آئی ہے۔

پھر یہ تفسیر کس قسم کی ہے اس کی کچھ مثالیں آپ کو اس مضمون میں ملیں گی جو چند صفحات آگے چل کر "تفسیر بالروایات" کے عنوان سے آپ کے سامنے آئے گا۔ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ اس قسم کی تفسیر کسی صورت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ تفسیر کی روایات کے متعلق امام احمد نے کہا تھا کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں۔

پھر سن لیجیے کہ اگر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر کے متعلق یقین سے کہا جا سکے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو اس کے سامنے کوئی مسلمان کا سر نہیں جھکے گا؟ لیکن جب یہ واقعہ ہو کہ آپ کسی حدیث کے متعلق بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ قولِ رسولؐ ہے۔ تو اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن کی یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر سے انکار نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے صرف یہ ہے کہ جس تفسیر کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے نہیں۔ ذرا سوچیے کہ اگر امام بخاریؒ پانچ لاکھ چورانوے ہزار حدیثوں کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ان کی دانست میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتیں، اور اس سے وہ منکرِ حدیث قرار نہیں پائے تو اگر آج کوئی شخص ایک حدیث کے متعلق کہتا ہے کہ اس کی بصیرتِ قرآنی کی رُو سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتی، تو وہ کافر اور خارج از اسلام کس طرح قرار پا سکتا ہے؟ وہ درحقیقت ایک جامع حدیث کے فیصلے یا راوی کی روایت کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے، ارشادِ نبویؐ سے انکار نہیں کرتا، وہ قولِ رسولؐ سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔

(۰)

اب ہم اس اعتراض کی طرف آتے ہیں جو بظاہر بڑا وقیع نظر آتا ہے اور جو اکثر لوگوں کے دل میں وجہِ اضطراب بنتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو قرآن کریم کے احکام پر عمل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

حدیث کو نہ مانیں تو نماز کیسے پڑھیں

مثلاً قرآن کریم میں نماز کا حکم ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ نماز کیسے پڑھی جائے اس کی کتنی رکعتیں ہوں، ہر

رکعت میں کیا کیا پڑھا جاتے، وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے اس حکم پر عمل کر کے دکھایا اور اسی کے مطابق ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہ کہنا کس قدر مبہم ہے کہ "اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو ....." حدیث کے وجود سے کون انکار کرتا ہے، احادیث کے مجموعے ہر جگہ ملتے ہیں۔ کہنا یہ چاہیئے کہ اگر ہم احادیث کو یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا ریکارڈ تسلیم نہ کریں تو پھر (مثلاً) ہم نماز کس طرح پڑھیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احادیث کو یقینی ماننے کے بعد بھی نماز کس طریق سے پڑھیں؟ یہ آپ کو معلوم ہے کہ شیعہ حضرات کی نماز سُنّی حضرات سے مختلف ہے۔ اور شیعہ اور سُنّی دونوں اپنی اپنی نماز کے متعلق دعوے کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مطابق ہے۔ پھر سنّی حضرات کی طرف آیئے تو اہلِ حدیث کی نماز اور حنفیوں کی نماز میں جس قدر فرق ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اور یہ دونوں فرقے بھی اپنی اپنی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان نمازوں میں سے کون سی نماز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی نماز تسلیم کیا جائے جبکہ ہر ایک کی نماز اور اس کی جزئیات کی سند میں احادیث موجود ہیں۔ کیا آج کوئی ایسا طریقہ معلوم کیا جا سکتا ہے جس سے یقینی طور پر متحقق ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح نماز ادا فرمائی تھی؟

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطع نظر) سنّیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فرعی سا ہے۔ اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ سو اوّل تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے تو وہ، اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے، تو کم از کم اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے۔ یہ جو آئے دن "دیوبندیوں اور بدعتیوں"، "بریلویوں اور دیوبندیوں کی مسجدوں پر تنازعے اٹھتے ہیں ـــــ امام قتل کر دیئے جاتے ہیں، مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے۔ پولیس مداخلت کرتی ہے، مسجد پہ تالا پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے ـــــ تو یہ نماز کے انہی فروعی اختلافات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، حقیقت کا بطلان اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مترادف ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیئے کہ جب کسی حکم کو خدا یا اس کے رسولؐ کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً قرآن کریم نے وضو کے سلسلہ میں کہا ہے۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ..... (۵/۶) اپنے منہ دھویا کرو۔ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ پہنچوں تک دھوئے، اور دوسرا کہنیوں تک، تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔ کیونکہ یہ فرق محض فرعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا۔ ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہی ٹھیک ہو سکتا ہے جس کا عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو۔ لہٰذا نماز کی جو جزئیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائی تھیں، جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی، نماز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مطابق قرار نہیں پائے گی۔ یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھا لئے یا نیچے رکھے۔ ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیر ناف۔ آمین بالجہر کہی یا خفی۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اتنا۔ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی، یا فلاں دعائیں پڑھ لی یا یوں۔ تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس۔ عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اتنی۔ نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے۔ محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے۔ اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہل حدیث سے کہیئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کر دے کہ اس کی نماز ہو گئی ہے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

لہٰذا سوچئے کہ کیا احادیث کو یقینی مان لینے کے بعد آپ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نماز کا فلاں طریقہ ٹھیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق ہے؟ ہاں! ہر ایک فرقہ یہ کہہ سکتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس کا طریقہ عین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق ہے۔ لیکن کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق ہو سکتا ہے؟ کیا آپ اسے باور کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں کچھ لوگ شیعوں کی سی نماز پڑھتے تھے اور کچھ سنیوں کی سی۔ یا کچھ لوگ اہل حدیث کی سی نماز پڑھتے تھے اور کچھ حنفیوں کی سی۔ یا خود رسولؐ اللہ کی کیفیت تھی کہ آپؐ کبھی اس طریق سے نماز پڑھتے اور پڑھاتے تھے جس طریق کے مطابق آج شیعہ نماز پڑھتے ہیں اور کبھی اس طریق کی نماز جیسی نماز آج سنی پڑھتے ہیں اور کبھی اہلحدیث کے طریقہ جیسی نماز اور کبھی حنفیوں کی سی نماز؟ ظاہر ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی جیسی نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہوں گے اور ساری اُمت ایک جیسی نماز پڑھتی ہوگی۔ دین میں اختلاف

کی گنجائش نہیں۔ اختلاف کو قرآن کریم اللہ کا عذاب اور فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔

جب صورت یہ تھی تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا اب ایسی صورت کسی طرح بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اُمّت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو جائے اور تمام مسلمان ایک جیسی نماز پڑھنے لگ جائیں؟ ظاہر ہے کہ جب تک

ایک نومسلم کیا کرے

آپ احادیث کو یقینی اقوال و افعالِ رسول اللہ تسلیم کرتے رہیں گے اس وقت تک اُمّت میں وحدت پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کی اپنی اپنی احادیث ہیں اور ہر فرقہ اپنی حدیثوں کو یقینی طور پر اقوال و افعالِ رسول اللہ قرار دیتا ہے۔ ساری اُمّت میں وحدت پیدا کرنا تو ایک طرف، موجودہ حالات میں تو ایک اور مشکل ایسی پیدا ہوتی ہے جس کا کوئی حل ہی نہیں۔ ایک نومسلم آج مسلمان ہوتا ہے۔ اور جس شخص کے ہاتھ پر وہ اسلام لاتا ہے وہ اتفاق سے (مثلاً) دیوبندی ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد اسے بتایا جاتا ہے کہ اسلام کا سب سے پہلا رکن ــــ اور کفر و اسلام میں وجہِ تفریق ــــ نماز ہے۔ وہ اُن مولوی صاحب سے نماز سیکھتا ہے اور انہی کے طریقہ کے مطابق نماز پڑھنے لگ جاتا ہے۔ لیکن ایک اہلِ حدیث مولوی صاحب اسے نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ جب نماز ہی نہ ہوئی ہو تو وہ مسلمان کیسے رہا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز نماز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس نومسلم کی اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟ سوچئے کہ یہ گہری سوچ کا مقام ہے۔ اس سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ احادیث اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتیں اس لئے کہ یہ مشکل تو پیدا ہی احادیث کی وجہ سے ہوئی ہے! اس مشکل کا صحیح حل کیا ہے۔ اسے ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا۔

(۰)

بحثِ سنّت

حدیث کے علاوہ، ایک لفظ سنّت ہے جو حدیث سے بھی زیادہ مروّج ہے۔ اور اس کا تعلق انتہائی نازک جذبات سے ہے۔ "اتباعِ سنّتِ رسول اللہ عین دین ہے" یہ الفاظ ہر طرف سے سنائی دیں گے لیکن یہ معلوم کر کے آپ حیران ہوں گے کہ سنّت کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے، اس کے متعلق بھی ہمارے علماء حضرات متفق نہیں۔ چند ہی سال ادھر کا ذکر ہے کہ صدر جمعیت اہلِ حدیث مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) نے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب (اور

اُن کے ہمنواؤں) کے مسلکِ حدیث پر سخت تنقید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ حضرات "سُنّت" سے جو مفہوم لیتے ہیں اس سے ان کے مسلک کے ڈانڈے منکرینِ حدیث سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رسالہ میں منکرین حدیث کی جو فہرست شائع کی تھی اس میں سرسید، مولانا شبلی، مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ مودودی صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور فرزندانِ ندوہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے متعلق لکھا تھا کہ

> یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقہ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔

مولانا اسماعیل مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ سُنّت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سُنّت کہا جاتا ہے۔ ان کی اس تعریف کی رُو سے "کتاب و سُنّت" کے معنی ہوں گے "قرآن و حدیث"۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک، سُنّت کا مفہوم اس سے الگ ہے۔ وہ اپنی کتاب "رسائل و مسائل" (حصہ اول) میں لکھتے ہیں۔

مودودی صاحب کے نزدیک

> سُنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا، اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سُنّت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ..... تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سُنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ ص۳۱۱ تا ص۳۱۲

اسی کتاب میں وہ ص۳۱۴ پر لکھتے ہیں:۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرز خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی مولانا اسماعیل مرحوم کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے۔

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں :-

جو امور آپؐ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (صفحہ ۳۰۰)

ان تصریحات کی روشنی میں، ایک عملی شکل کو سامنے لایئے کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی گئی ہے کہ یہاں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ ایک قانون ملک میں نافذ ہو جاتا ہے۔ مولانا اسماعیل مرحوم یا ان کے ہم عقیدہ حضرات چیلنج کرتے ہیں کہ وہ "سنت" کے خلاف ہے اس لئے وہ قانون ناجائز ہے اس کی تائید میں وہ ایک حدیث پیش کر دیتے ہیں۔

اس کا نتیجہ

ان کے مقابلہ میں مودودی صاحب کہتے ہیں کہ وہ قانون سنّت کے خلاف نہیں۔ اوّل الذکر حضرت دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے جو حدیث پیش کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ مودودی جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیث تو صحیح ہے لیکن رسول اللہ نے وہ عمل، اپنی بشری حیثیت سے عادۃً فرمایا تھا، رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اس کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ حضورؐ نے وہ کام عادتاً کیا تھا مودودی صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی مدد سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسول" ہی کر سکتا ہے (تفصیل پہلے گذر چکی ہے)

فریقِ ثانی اس کے جواب میں کہتا ہے:۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے۔ جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلف مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنّتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔
>
> (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث۔ صفحہ ۹۳)

یعنی جس چیز کو مودودی صاحب سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیتے ہیں، اسے اہلِ حدیث حضرات سنّت کے خلاف ہوائی حملے سے تعبیر کرتے ہیں اور سنّت کو ایسے حملوں سے محفوظ رکھنے کو اپنا فریضہ قرار دیتے ہیں۔

اصلاحی صاحب

یہاں تک بات صرف مودودی صاحب اور مولانا اسماعیل مرحوم کے درمیان تھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس باب میں لکھتے ہیں:۔

> حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبیؐ کی نسبت کے ساتھ کی جائے!
> لیکن سنّت سے مراد نبیؐ کا صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا ہو، جس کی آپؐ نے محافظت فرمائی ہو، جس کے حضورؐ عام طور پر پابند رہے ہوں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۳)

اس کے متعلق مولانا اسماعیل مرحوم فرماتے ہیں:۔

> مولانا (اصلاحی) نے سُنّت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا اطلاق ہو بھی تو چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرتؐ سے علیٰ سبیل الاستمرار ہے جیسے نقل کا ثبوت ممکن .... ہزار دفعہ فرمایا جائے کہ "اگر کوئی شخص اس سُنّت کو بحیثیت دین تسلیم نہیں کرتا تو ہم اسے مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس سُنّت کی بنیاد تو بہت کمزور ہے [illegible] اس کا حاصل چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ سے ہی ثابت کرنا ہوگا۔ پھر اس رد و کد کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (ایضاً صـ [illegible])

یہ ہے "سُنّت" کی تعریف کے متعلق ان حضرات کا وہ اختلاف جس کی بنا پر مولانا اسماعیل مرحوم نے کہا تھا کہ:-

> میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (ایضاً صـ۱۱۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب و سُنّت" کا متفقہ مطالبہ کرنے والوں میں اس امر پر بھی اتفاق نہیں کہ "سُنّت" کہتے کسے ہیں؟ جو چیز ایک کے نزدیک "سُنّت" ہے وہ دوسرے کے نزدیک "بدعت اور دین میں تحریف" ہے۔

(۰)

جب علماء کرام نے مطالبہ کیا کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق درج کی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو "کتاب و سُنّت" کے خلاف ہو تو ہم نے کہا کہ اس شرط کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے مسلمانوں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس لئے کہ "کتاب" (قرآن مجید) تو ہر فرقہ کے نزدیک متفق علیہ[1] ہے لیکن "سنت" ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ اس پر شور مچا دیا گیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ سُنّت ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ کافر ہے، مرتد ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کامل بیس برس تک یہ حضرات طلوعِ اسلام کو کافر و مرتد کہتے رہے لیکن کتاب و سنت، کی رُو سے نہ کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب ہو سکا

---

[1] یہاں ہم نے شیعہ حضرات کے مسلک سے بحث نہیں کی۔

تھا، نہ مرتب ہوا، بالآخر مودودی صاحب کو اعتراف، اور اعلان کرنا پڑا کہ

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو ملک ... کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں، اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا۔ مؤرخہ ۲۳ ر اگست ۱۹۷۰ء)

اس سے واضح ہے کہ جب تک اسلام، مختلف فرقوں میں بٹا رہے گا، ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید (یا معیار) کے مطابق سنت کا اتباع کرتا رہے گا لیکن جونہی آپ اُسے وحدتِ اُمت کی اجتماعی شکل دینے کی کوشش کریں گے، (موجودہ تصور کے مطابق) اتباعِ سنت ناممکن ہو جائے گا۔

اس سے وہ گوشہ سامنے آتا ہے جو اس ساری بحث کا محور یا مرکز ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے — اور بار بار حکم — کہ تم رسولؐ کی اطاعت کرو، جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے رسولؐ کی اطاعت سے سرتابی کی وہ سیدھا جہنم میں جا پہنچا۔ لہٰذا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر احادیث کو نہ مانا جائے تو پھر رسول اللہؐ کی اطاعت کی صورت کیا ہو سکتی

اطاعتِ رسولؐ کیسے کی جائے؟

ہے؟ یہی ہے وہ سب سے اہم اور بنیادی سوال جو اس سلسلہ میں سامنے لایا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کو اقوال و افعال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماننے اور ان کے مطابق عمل کرنے کو قرآن کی رُو سے ثابت کیا جاتا اور ایمان اور اسلام کا بنیادی تقاضا قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سوال واقعی بڑا اہم ہے اور اس قابل کہ اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال کے جواب تک آئیں خود اس سوال کے ایک بنیادی سقم پر غور کرنا ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ

(۱) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت از روئے قرآن فرض ہے۔

(۲) اور رسول اللہؐ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث کے علاوہ کوئی نہیں۔

(۳) اس لئے ضروری ہے کہ ہم احادیث کو یقینی طور پر اقوال و افعال رسول اللہؐ تسلیم کریں۔ یعنی اگرچہ احادیث کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ظنّی ہیں یقینی نہیں۔ لیکن چونکہ انہیں یقینی مانے بغیر اطاعتِ رسولؐ کا فریضہ ادا نہیں ہو سکتا، اس لئے ضروری ٹھہرا کہ انہیں یقینی مانا جائے۔ اس دلیل کا بودا پن بالبداہت واضح ہے۔ یہ وہی بات ہے جیسے کسی نے کہا تھا۔

تز ذوقِ بندگی، پروردگارے کردہ ام پیدا

اب آیئے اصلی سوال کی طرف۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث (بلکہ نفسِ اسلام) کے بارے میں جس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان سب کی بنیادی وجہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کے صحیح مفہوم کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا ہے۔ اس سے عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی دو الگ الگ اطاعتیں ہیں۔ اللہ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت احادیث کے ذریعے۔ سو اوّل تو یہ بنیاد ہی صحیح نہیں کہ اطاعتیں دو ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز نہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر رسولؐ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث تھیں تو (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ نہایت ضروری اور دین کا اوّلین تقاضا تھا کہ قرآن کی طرح احادیث کو بھی، خدا کی ضمانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضۂ رسالتؐ کے تقاضا کی رُو سے، ہر طرح سے محفوظ کیا جاتا۔ تاکہ ہر شخص یقینی طور پر رسولؐ کی اطاعت کر سکتا۔ جس طرح خدا کی اطاعت سے یہ مقصد نہیں کہ جن باتوں کو ہم اپنے تصور کے مطابق خدا کے احکام قرار دے لیں، ان کی اطاعت کر لیں۔ خدا کی اطاعت سے مقصود ہے خدا کی کتاب کی اطاعت۔ جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا اور جسے محفوظ اور منضبط شکل میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو دیا، اور وہ اُمّت کے پاس اسی طرح محفوظ چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح رسولؐ کی اطاعت سے بھی مقصود نہیں ہو سکتا کہ جن باتوں کو ایک فرد یا ایک فرقہ اپنے طور پر احکامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ لے ان کی اطاعت کر لے۔ اطاعت کے لئے متعین اور یقینی احکام کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا خود یہ حقیقت کہ احادیث کی حفاظت کا ذمہ نہ خدا نے لیا اور نہ ہی انہیں رسول اللہ نے منضبط اور محفوظ کر کے اُمّت کو دیا، اس امر کی بدیہی شہادت ہے کہ احادیث کی رُو سے، اطاعتِ رسولؐ نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اطاعتِ رسولؐ احادیث کے ذریعے نہیں ہو سکتی تو پھر اس کا ذریعہ اور طریقہ کیا ہے؟

اسلام ایک اجتماعی نظام ہے

اصل یہ ہے کہ اسلام، (عام تصور کے مطابق) مذہب نہیں جس میں ہر شخص، اپنے اپنے طور پر احکام کی اطاعت کر لیتا ہے۔ اسلام، ایک اجتماعی نظامِ زندگی ہے جس میں اطاعت، نظامِ مملکت کے ذریعے اجتماعی طور پر کی جاتی ہے۔ اسلامی مملکت

یا نظام "۔۔۔۔ خدا کے احکام نافذ کرنے، یا لوگوں سے ان کی اطاعت کرانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس قسم کا نظام سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا جس کا مقصد اُمّت سے احکام خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ اس لئے قرآن کی اصطلاح "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کا مطلب تھا، خدا کے احکام کی اطاعت، اپنے اپنے طور پر نہیں بلکہ اُس نظام کے ذریعے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ہے۔ خدا کے احکام قرآن کریم میں منضبط تھے اور رسولؐ اللہ بہ حیثیت مرکزِ نظامِ خداوندی ان احکام کی اطاعت، حالات کے تقاضے کے مطابق، افرادِ معاشرہ سے کراتے تھے۔

دوسری قابلِ غور یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم میں کچھ احکام دیئے گئے ہیں۔ لیکن بیشتر امور میں صرف اصولی ہدایات دی گئی ہیں۔ نظام خداوندی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات، حالات کے تقاضے کے مطابق، جماعتِ مومنین کے مشورے سے خود مرتب کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اس کی یہی غرض تھی۔

اصولوں کی جزئیات

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ان اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔ مثلاً قرآن کریم میں زکوٰۃ کا حکم متعدد مقامات پہ آیا ہے لیکن کسی جگہ بھی اس کی شرح یا نصاب کا ذکر نہیں۔ یعنی یہ ایک اصولی حکم تھا جس سے مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظام، افراد و معاشرہ کی جسمانی پرورش اور انسانی ذات کی نشوونما کا انتظام کرے۔ اس انتظام کی شکل کیا ہوگی۔ اس کے لئے ذی استطاعت افراد سے کیا کچھ لیا جائے گا۔ اسے کس طرح خرچ کیا جائے گا۔ یہ سب جزئیات اس نظام نے مرتب کرنی تھیں۔ نبی اکرمؐ نے جب اس کا انتظام فرمایا تو اس کے لئے ایک شرح (اڑھائی فیصد) مقرر فرمائی ہوگی کیونکہ اس زمانے کے حالات کے مطابق اتنے ہی سے ضروریات پوری ہو گئی ہوں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے مطلب یہ نہیں تھا کہ "زکوٰۃ دو" پر عمل کرنے سے خدا کی اطاعت ہوگئی اور اڑھائی فیصد دینے سے رسولؐ کی اطاعت ہوگئی۔ اُس وقت کے اسلامی نظام میں اڑھائی فیصد دے دینے سے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" پوری ہو جاتی تھی۔

یہ نظام آگے چلا

اسلامی نظام نبی اکرمؐ کی ذات تک ہی محدود نہیں تھا کہ حضورؐ کی وفات سے یہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔ اسے تو قیامت تک آگے مسلسل چلنا اور قائم رہنا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ نظام، خلافتِ راشدہ کی شکل میں قائم ہوا۔ اب "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" سے مراد تھی خدا کے احکام کی اطاعت اُس نظام کی رُو سے جس کا مرکز خلیفۃ الرسول تھا۔ اُس زمانے میں، انداز یہ تھا کہ قرآن کے احکام

کی اطاعت اُسی طرح کرائی جاتی تھی جس طرح حضورؐ کے زمانے میں ہوتی تھی کیونکہ یہ احکام غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ باقی رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں، حضورؐ کے زمانے میں مرتب ہوتی تھیں، تو ان میں سے جن میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہ ہوتی، انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا۔ جن میں حالات کی تبدیلی سے کسی تغیر و تبدل کی ضرورت ہوتی، ان میں ضروری تبدیلی کر دی جاتی۔ اور جہاں کسی نئی شق کی ضرورت پڑتی اس کا اضافہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ اُس زمانے میں، رسول اللہؐ کی عہد مبارک کی متعین کردہ جزئیات میں جو تبدیلیاں کی گئیں یا جن نئی شقوں کا اضافہ کیا گیا ان کی تفصیل تاریخ میں موجود ہے[1]۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ قرآن کریم نے تمام احکام کی تفاصیل خود ہی کیوں نہیں دیں، اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے جزئی احکام اور فیصلوں کو منضبط اور محفوظ شکل میں اُمّت کو کیوں نہ دیا۔ قرآن کے احکام اور اصولوں کو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا۔ اس لئے انہیں محفوظ کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں جن جزئیات کو مرتب ہونا تھا، وہ زمانے کے حالات کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل تھیں اس لئے انہیں محفوظ نہیں کیا گیا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ صحابہ کبارؓ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی احادیث کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ اس سے سختی سے روکا۔ اس لئے کہ اگر انہیں محفوظ کر دیا جاتا تو اس کا احتمال تھا کہ بعد میں انہیں قرآن کی طرح غیر متبدل سمجھ لیا جاتا۔

جب تک خلافت کا نظامِ خداوندی قائم رہا، یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رہی اور "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" احادیث کے بغیر ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد بدقسمتی سے یہ سلسلہ قائم نہ رہا۔ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی۔ دین اپنی حقیقی شکل میں قائم نہ رہا۔ اس میں "مذہب اور سیاست" کی ثنویت پیدا ہو گئی۔ امورِ سیاست کو سلاطین نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مذہبی امور (عقائد، عبادات یا زیادہ سے زیادہ نکاح، طلاق سے متعلق شخصی قوانین) "علماء" کے سپرد کر دیئے گئے۔ اب "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کا وہ تصور بھی باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ جب حکومت کا فریضہ احکامِ خداوندی کی تنفیذ نہ رہا تو اس کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" نہ رہی۔

بعد میں کیا ہوا؟

اس وقت یہ سوال اُٹھا کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اگر اُمّت کی قسمت نیک ہوتی تو اُس وقت فیصلہ یہ کیا جاتا کہ ہمیں وہ نظام پھر سے قائم کرنا چاہیئے

---

[1] ان امور کی تفاصیل پرویزؔ صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب ـــ "شاہکارِ رسالتؐ" میں ملیں گی۔

جس میں نظامِ خداوندی کی اطاعت، "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" ہوتی تھی۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس کے اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ یہ سمجھا جاتا کہ خدا کی اطاعت، قرآن کے ذریعے کی جائے اور رسولؐ کی اطاعت حضورؐ کے ارشادات کی فراہم برداری سے۔ اس سے احادیث کے جمع اور مضبوط کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اس کے بعد چونکہ آج تک پھر خلافت علیٰ منہاج نبوت کا نظام کہیں قائم نہیں ہوا۔ اس لئے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کا حقیقی مفہوم اور طریق بھی سامنے نہیں آیا۔ اس تمام عرصہ میں، توجہات کا مرکز حدیث ہی رہی (زیادہ تر احادیث کی روشنی میں مرتب کی جاتی رہی)۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں احکام بہت تھوڑے سے تھے اور زندگی کی عملی ضرورت ان سے کہیں زیادہ۔ ان ضروریات کو اُن جزئی احکام نے پورا کرنا تھا جنہیں خلافت مرتب کرتی۔ اب ان کی عدم موجودگی میں، بار بار نگاہ حدیثوں کی طرف اٹھتی تھی۔ جب عام متداول حدیثیں بھی اس مقصد کے لئے ناکافی ہو گئیں تو پھر نئی نئی حدیثیں وضع کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہی حدیثوں کی رُو سے مختلف فرقے وجود میں آتے گئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث فراہم یا عند الضرورت وضع کر لیں۔ اس سلسلہ پر جب صدیاں گزر گئیں تو اس تصور نے ایک محکم عقیدہ بلکہ ایمان کی شکل اختیار کر لی کہ رسولؐ اللہ کی اطاعت احادیث کے ذریعے ہوتی ہے اور احادیث کو "نہ ماننے والا" منکرِ رسالت ہے۔ یہ ہے وہ غلط فہمی جو دین کے معاملہ میں تمام الجھنوں کا بنیادی سبب ہے۔

اس کا حل اس الجھن سے نکلنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکت اس امر کا فیصلہ کرے کہ اس نے قرآن کریم کے احکام و اصولات کے مطابق حکومت کرنی ہے۔ وہ قرآن کے احکام کو نافذ کرے۔ اس کے بعد دیکھے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق قرآن کیا اصولی راہنمائی دیتا ہے اور ہماری قانونی ضروریات کیا ہیں۔ حدیث (اور فقہ) کا جو سرمایہ ہمارے ہاں متوارث چلا آرہا ہے اگر اس میں ایسے قوانین مل جائیں جو قرآنی اصول کے مطابق ہوں اور ہماری ضروریات کو پوری کریں، انہیں اپنے ہاں بطور قانون مملکت جاری کرے۔ جہاں ایسے قوانین نہ ملیں، قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے لئے جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ اصولی غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین، خواہ وہ پہلے سے مرتب شدہ ہوں یا اس مملکت کے خود مرتب کردہ،

سلہ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کے زمانے کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال بھی اس کا محرک تھا۔ مقصد دونوں محرکات کا ایک ہی تھا کسی نے واقعات کے قلمبند کرنے پر زیادہ زور دیا، کسی نے احکام کو جمع کرنے پر۔

عند الضرورت بدلتے رہیں گے۔ ان قوانین کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمانوں پہ یکساں طور پر ہوگا اور اس میں کسی فرقہ کی تمیز و تفریق نہیں ہوگی۔ اسی طرح یہ مملکت شعائرِ اسلامی میں بھی وحدت پیدا کرتی جائے گی۔ اس سے رفتہ رفتہ معاشرہ کی وہی کیفیت ہو جائے جو عہدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و الذین معہٗ میں تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی نظام میں، قرآن کے احکام اور اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں گے لیکن ان قوانین پر عمل کرانے کے طریق اور ان اصولوں کی روشنی میں وضع کردہ جزئیات، زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ علامہ اقبالؒ اس سلسلہ میں اپنے خطباتِ "تشکیلِ جدید" میں فرماتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور متغیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں ..... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور منقلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے متقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

احادیث کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:-

> احادیث کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی حالہٖ رکھا اور بعض میں ترامیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علی حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح

طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو، انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود نہ تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبری تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کرے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کیلئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا، پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذّات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ ابو حنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تین سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث

کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطباتِ اقبالؒ۔ صفحہ ۱۶۲-۱۶۳)

نبی اکرمؐ کے زمانے کے احکام میں تغیر و تبدل کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں :-

مودودی صاحب اور جزئیاتِ دین

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں ...... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔

(تفہیمات حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۷)

وہ اسی کی تفصیل میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

مدینہ طیبہ سے مماثلت پیدا کرنے کا مفہوم کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم ظاہری اشکال میں مماثلت

پیدا کرنا چاہتے ہیں اور دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہش مند ہیں جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے اور اکثر دین دار لوگ غلطی سے اس کا یہی مفہوم لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سلفِ صالحین کی پیروی اس کا نام ہے کہ تمدن و حضارت کی جو حالت ان کے عہد میں تھی اس کو ہم بالکل متحجر FOSSILIZED صورت میں قیامت تک باقی رکھنے کی کوشش کریں اور ہمارے اس ماحول سے باہر کی دنیا میں جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سب سے آنکھیں بند کر کے ہم اپنے دماغ اور اپنی زندگی کے اردگرد ایک حصار کھینچ لیں جس کی سرحد میں وقت کی حرکت اور زمانے کے تغیر کو داخل ہونے کی اجازت نہ ہو۔ اتباع کا یہ تصور جو دورِ انحطاط کی کئی صدیوں سے دینداء مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط ہے۔ درحقیقت روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو فدیۂ تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ بنائے رکھیں۔ وہ ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔ اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں جو تغیر و ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر و ارتقاء کو غلط راستوں سے روک کر صحیح راستوں پر چلانے کی کوشش کرے۔ وہ ہم کو قالب نہیں دیتا بلکہ روح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں، ان سب میں یہی روح بھرتے چلے جائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصلی مشن یہی ہے کہ ہم کو "خیر امۃ" جو بنایا گیا ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ ہم ارتقاء کے راستے میں آگے بڑھنے والوں کے پیچھے عقب لشکر REAR GUARD کی حیثیت میں لگے رہیں۔ بلکہ ہمارا کام امامت و رہنمائی ہے۔ ہم مقدمۃ الجیش بننے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارے "خیر امۃ" ہونے کا راز "اخرجت للناس" میں پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ کا اصلی اُسوہ جس کی پیروی ہمیں کرنی چاہیئے، یہ ہے کہ انہوں نے قوانینِ طبعی کو قوانینِ شرعی کے تحت کر کے زمین میں خدا کی خلافت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ ان کے عہد میں جو تمدن تھا انہوں نے اس کے قالب میں روح پھونکی ـــ پس نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ کا صحیح اتباع یہ ہے کہ تمدن

کے افکار اور قوانین طبعی کے اکتشافات سے اب جو وسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم
اسی طرح تہذیب اسلامی کا خادم بنانے کی کوشش کریں جس طرح صدر اوّل میں کی گئی تھی۔
(نشانِ راہ صـ۵۵)

مولانا امین احسن اصلاحی کا مسلک یہ ہے کہ قرآن ہی نہیں، بلکہ احادیث میں بھی بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں اور جزئیات کا تعین اُمت کی صوابدید پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے ان میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ اس خلا کو حالات و ضروریات کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء اور مزاج کے مطابق قوانین بنانا اُمت کی صوابدید پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۵۵ء)

ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" یا "خدا اور رسول کی معصیت" کا ذکر آیا ہے اس سے مراد وہ نظامِ حکومت ہے جسے احکامِ خداوندی کے نافذ کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہو۔ دیکھئے مودودی صاحب اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں کہا گیا ہے کہ اِنّما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہٗ .... "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ" اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مودودی صاحب، اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں:۔

خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مقصد اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول صـ۴۶۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

لہٰذا، خدا اور رسولؐ کی اطاعت سے مراد اپنے اپنے طور پر، قرآن اور احادیث کی اطاعت نہیں، بلکہ اس نظامِ خداوندی کی سنٹرل اتھارٹی (مرکز) کی اطاعت ہے جو احکامِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے قائم ہو۔ یہ اس کا کام ہے کہ دیکھے کہ ان احکام کی اطاعت کس طرح کرائی جا سکتی ہے۔ اسی کا نام "اتباعِ سُنّت" ہے جس سے سرکشی اختیار کرنے والا محض نظری طور پر "مرتد" قرار نہیں پاتا بلکہ عملاً بغاوت کے جرم کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔
اس نظام کی عدم موجودگی میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت، انفرادی عمل رہ جاتا ہے جس کی پابندی ہر فرد یا ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق کرتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد خدا اور رسولؐ کی اطاعت، اس نظام کے فیصلوں کی اطاعت کی رُو سے کی جاتی ہے۔ یہی دین کا مقصود ہے اور اسی سے اُمّت میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔

سیرتِ طیبہ

ہمارے احادیث کے مجموعوں میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی ہے جن کا تعلق نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے حالات و کوائف سے ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ اقدس، انسانی شرف و مجد کی معراجِ کبریٰ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ان روایات میں بعض ایسی بھی ہیں جن سے آپؐ کی سیرت داغدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ قرآن کریم کی روشنی میں از سرِنو مرتب کی جائے اور کتبِ روایات میں سے صرف وہی حصہ لیا جائے جو قرآن کریم کے مطابق ہو۔ جو روایات قرآن کے خلاف ہوں، یا ان سے حضورؐ یا صحابہ کرامؓ کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، انہیں مسترد کر دیا جائے۔

(۰)

یہ ہے حدیث کی صحیح پوزیشن۔ جب تک ہم اس پوزیشن کو قبول نہیں کریں گے اور سرمایۂ حدیث کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھیں گے، ہم ان الجھنوں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے جن میں اُمت صدیوں سے گرفتار چلی آرہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ اس حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(۰)

ضرورتِ رشتہ:

۱۔ قرآنی گھرانے کی ایک چوبیس ۲۴ سالہ دوشیزہ کے لئے جو ایم بی بی ایس (M.B.B.S.) کے فائنل ایئر کی طالبہ ہے مناسب رشتہ درکار ہے۔ لڑکے کا اچھا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ خواہشمند حضرات اس پتہ پر خط و کتابت کریں۔

"ج ف ص" معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور ۱۱ پوسٹ کوڈ ۵۴۶۶۶

۲۔ قرآنی گھرانے کی ایک ایم بی بی ایس لیڈی ڈاکٹر کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ خواہشمند حضرات درج ذیل پتہ پر رجوع فرمائیں۔ و ب د معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

احباب کا شکریہ:

جن احباب نے محترم محمد اسلام صاحب کے حادثہ کی خبر کے بعد ان کی خیریت پوچھی ہے وہ ان تمام احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نقد و نظر

نام کتاب = ابلیس مسجد۔
تصنیف = جناب صابر صدیقی و عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ۔
ناشر = بزمِ طلوعِ اسلام پشاور بذریعہ شیریں محل ۳/۵ یونیورسٹی ٹاؤن پشاور۔
صفحات = ۱۹۲۔ قیمت تیس روپے۔

مودودی صاحب نے قیامِ پاکستان کی بھرپور مخالفت کی تھی، لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ ملک قائم ہو گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ صاحب، پاکستان تشریف لے آئے۔ اور اپنے آپ کو اسلامی نظام کے علمبردار کے طور پر پیش کرنا شروع کیا، پرویزؒ صاحب جانتے تھے کہ یہ صاحب اسلامی نظام کی علمبرداری کے پردے میں اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان کے مذموم عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ اس سے مودودی صاحب اور ان کی جماعت ہاتھ دھو کر، پرویزؒ صاحب کے پیچھے پڑ گئی، ان پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا کہ وہ منکرِ حدیث ہیں، حالانکہ خود مودودی صاحب، حدیث کے سب سے بڑے منکر تھے اس مقصد کے لئے انہوں نے جو مزاج شناسیِ رسول کا اصول پیش کیا تو وہ انکارِ حدیث سے بھی زیادہ بدتر تھا۔ کیونکہ اس کے سہارے جھوٹی حدیثوں کو تسلیم کر لیا جاتا ہے اور سچی حدیثوں کو رد کر دیا جاتا ہے، مودودی صاحب نے عملاً یہی طریقہ اختیار کیا اس کے برعکس حدیث کے بارے میں پرویزؒ صاحب نے جو نقطۂ نظر پیش کیا وہ خود بہت سے سلف صالحین سے منقول تھا یعنی صرف ایسی احادیث قابلِ قبول ہیں جو قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے بہت سے ائمہ کا یہی مسلک تھا۔

لیکن جماعتِ اسلامی نے پرویزؒ صاحب کے منکرِ حدیث ہونے کا پروپیگنڈہ اس شد و مد سے کیا، کہ ہمارے نیم تعلیم یافتہ علماء کو اصل حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اور جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا ان حضرات نے تو اپنی درسی کتابوں کا کبھی اچھی طرح مطالعہ تک نہیں کیا، وہ پرویزؒ صاحب کی کتابیں کہاں پڑھتے؟ اس لئے انہوں نے مطالعہ کئے بغیر اُس راگ کو الاپنا شروع کر دیا، جو جماعتِ اسلامی نے چھیڑا تھا۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعے پرویزؒ صاحب کے خلاف زہر اگلنے لگے۔ ان حضرات

کا خیال تھا کہ پرویزؒ صاحب کی وفات کے بعد، ان کا لگایا ہوا پودا مرجھا جائے گا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو مرجھانے کی بجائے، تناور درخت بننے لگا ہے، تو ان کے سینوں پر حسد و بغض کے سانپ لوٹنے لگے۔ ان میں سے ایک تو سینیٹر (مولوی) سمیع الحق ہیں جنہوں نے کذب بیانی کی پرانی تمام مثالوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور (ایوانِ بالا) سینیٹ کے اعلیٰ ترین مقام سے وہ جھوٹ بولا جس کی مثال نہیں ملتی (ملاحظہ ہو) اور پھر بھی وہ خود ساختہ قائدِ شریعت کے منصب پر سرفراز ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت اسی کذب بیانی کا نام ہے۔

انہی حضرات میں سے ایک اور مولوی محمد اسرار اللہ ممدار نے جو اپنے آپ کو ڈسٹرکٹ خطیب مردان بتلاتے ہیں اور مفتی اور علامہ بھی ظاہر کرتے ہیں (یعنی تنخواہ دار مولوی، اور مفتی (فتویٰ دینے والے) غالباً وہ بھی ثمناً قلیلاً وصول کر کے) اور علامہ (یقیناً اس علامیت کی نسبت علم سے تو نہیں ہو سکتی، اغلب یہی ہے کہ یہ جہالت کے علامہ ہیں، جیسا کہ ان کی کتاب زیر تبصرہ کے مندرجات سے ظاہر ہے) نے پرویزؒ صاحب کے خلاف دھرائے جانے والے الزامات کو اب کتابی صورت میں "پرویز اور قرآن" کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔

پرویزؒ صاحب اس قسم کی کتابوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا کرتے تھے اور وہ اس کتاب کا بھی کوئی نوٹس نہ لیتے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں، ایسے قارئین اگر جناب ممدار اللہ صاحب کی کتاب کو پڑھتے، تو ان پر مولوی صاحب کی جہالت خود بخود آشکارا ہو جاتی۔ لیکن ہمارے نیم تعلیم یافتہ علماء نے جن میں (ایم، بی، بی، ایس) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، صوبہ سرحد کے معزول شدہ وزیر مذہبی امور (مولوی) عبدالباقی صاحب، (مولانا) سمیع الحق کے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے بانی (مولوی) عبدالحق صاحب اور مولوی قاضی زاہد الحسینی صاحب، وغیرہ شامل ہیں، نے اس کتاب کو اس طرح پیش کرنا شروع کر دیا ہے کہ شاید یہ کوئی آسمانی صحیفہ ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل نے پرویزؒ صاحب کے چند عقیدت مندوں کو مجبور کیا کہ وہ مولوی صاحب کی اسلام سے جہالت کو آشکارا کریں۔ زیر تبصرہ کتاب "ابلہ مسجد" ان کی اس کوشش کا نتیجہ ہے۔

مولوی ممدار اللہ صاحب نے اپنی کتاب "پرویز اور قرآن" میں پرویزؒ صاحب پر جتنے الزامات لگائے ہیں محترم صابر صدیقی اور محترم عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ نے ان کا نہایت ہی عالمانہ تجزیہ کر کے، بڑے مفصل جوابات دیئے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب جلدی میں تیار کی، وگرنہ وہ تھوڑی سی محنت کر کے یہ بھی ثابت کر سکتے تھے کہ جناب مولوی صاحب نے اپنی درسِ نظامی کی کتابوں کا بھی مطالعہ نہیں کیا اور انہوں نے پرویزؒ صاحب پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ ان کی جہالت

کا نتیجہ ہیں۔ انکارِ حدیث کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ خود مودودی صاحب کا نظریہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ بلکہ انکارِ حدیث سے بھی زیادہ مذموم ہے، لیکن چونکہ ہمارے علماء کا علم زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اس کا کبھی نوٹس نہیں لیا۔

مولوی صاحب کا دوسرا بڑا اعتراض حضرت آدم اور فرشتوں کے بارے میں ہے۔ اگر مولوی صاحب حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا تھوڑی دیر کے لئے مطالعہ کر لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس بارے میں پرویزؒ صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ بلکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور دوسرے بہت سے اکابرینِ اُمت کا یہی مسلک ہے۔ دراصل ہمارے قدیم تعلیم یافتہ علماء عربی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے خلیفہ کے غلط معنے کرتے ہیں، اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے جبکہ مودودی صاحب نے خلیفہ کے یہی معنی کئے ہیں۔ جبکہ علامہ الماوردی نے اپنی مشہور کتاب الاحکام السلطانیہ میں یہ لکھا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے تمام اہلِ علم کا اس امر پر اجماع ہے کہ جو کوئی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ سمجھے، وہ فاسق و فاجر ہے (صفحہ ۱۴) ان کی اس تحقیق کے مطابق ہمارے یہ علماء فاسق و فاجر قرار پاتے ہیں۔ پرویزؒ صاحب نے انہیں گناہ کی اس دلدل سے نکالنے کیلئے خلیفہ کا صحیح مفہوم ان کے سامنے پیش کیا تو یہ ان کے مشکور ہونے کی بجائے، الٹا اُن پر کیچڑ اچھالنے لگے۔

تیسرا مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ جسے مولوی مدرار اللہ صاحب اسلامی عقیدہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں (صفحہ ۵۵) حالانکہ اب تو قدامت پسند علماء بھی یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ خلافِ اسلام ہے کیونکہ اس سے قرآنِ مجید کی محکمیت متاثر ہوتی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی کتاب میں جس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ مسئلہ ملکیتِ زمین ہے (صفحہ ۷۹) خود کتاب زیرِ تبصرہ میں اس مقصد کے لئے بیس سے زیادہ صفحات مخصوص کئے گئے ہیں۔ اور بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا گیا ہے۔ کہ یہ کتاب غیر حاضر زمینداروں کے تعاون سے انہیں بچانے کے لئے شائع کی گئی ہے، مولوی صاحب کا دعوےٰ ہے کہ اسلام میں بے حد و نہایت ملکیتِ زمین جائز ہے اور پرویزؒ صاحب نے جو یہ قرآنی اصول پیش کیا ہے کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس کے بندے صرف اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ خلافِ اسلام ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے درسِ نظامی کی ابتدائی کتاب "ھالا بد منہ" بھی نہیں پڑھی جو ہر مولوی کے لئے پڑھنی لازمی ہے۔ اس کتاب کے مصنف قاضی ثناء اللہ پانی پتی ہیں، اور انہوں نے یہ کتاب خاص طور پر مدرار اللہ صاحب جیسے ان پڑھ مولویوں کے لئے لکھی تھی جو اپنی کم علمی کی وجہ سے مسائل میں الجھ جاتے تھے، انہوں نے اس کتاب میں سے ان تمام مسائل کو خارج کر دیا جن کا تعلق صغیر ہندو

و پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا، انہی میں سے ایک عشر کا مسئلہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کی ساری اراضی خراجی ہے، لہٰذا یہاں عشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ خراجی اراضی اسلامی مملکت کی ملکیت ہوتی ہے اور پرویز صاحب نے یہی کچھ قرآن مجید سے ثابت کیا ہے۔ ان حضرات کو جب اپنے درسِ نظامی کی ابتدائی کتاب "مالا بدمنہ" کی سمجھ نہیں تو قرآنِ مجید ان کی سمجھ میں کیسے آسکتا ہے!

اگلا مسئلہ قربانی کا ہے۔ قربانی خود علماء کے نزدیک حج کا رکن نہیں، یعنی حج قربانی کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے ملک کے حاجی جو حج کے موقع پر قربانی کرتے ہیں، اس کا اس قربانی سے کوئی تعلق نہیں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ ایک غلط قسم کا حج ادا کرنے کا جرمانہ ہے۔ سلفِ صالحین کے نزدیک حجِ تمتع زمانۂ جاہلیت کا حج تھا، جسے صحابہ کرام پسند نہیں کرتے تھے۔ خود قرآن مجید میں اسے ناپسند کیا گیا ہے اور اس کی سزا کے طور پر قربانی یا دس دن کے روزے لازمی قرار دیئے گئے ہیں، یعنی اس جرمانے کی صورت میں بھی قربانی لازمی نہیں، دس دن کے روزے بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب حجِ افراد یا حجِ قران ادا کرے تو اسے کسی قسم کی قربانی دینے کی ضرورت نہیں۔ مولوی محمد اشرف صاحب، پرویز صاحب پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے اگر اپنے ہم وطنوں کو صحیح حج کرنے کی رہنمائی کرتے تو ان کا بھلا ہوتا۔

آخری مسئلہ معراج کے واقعہ کے بارے میں ہے اور اس بارے میں ہمارے حضرات پرویز صاحب کو سب و شتم کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کا لہجہ ایسے مجبور ہیں انہیں اس حقیقت کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ سلفِ صالحین میں سے کن پاکیزہ ہستیوں پر گندگی اچھال رہے ہیں۔ اس بارے میں مولوی محمد اشرف صاحب فرماتے ہیں کہ جسمانی معراج کا انکار کرکے پرویز صاحب اپنی جبلّی حماقت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آفتابِ عالمتاب کو اپنی انگلیوں سے چھپانے کی ناپاک اور احمقانہ کوشش کررہا ہے۔ مولوی محمد اشرف صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خود صحابہ کرام میں سے بعض نے اس واقعہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان صحابہ میں حضرت عائشہؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسن بصریؒ شامل تھے۔ خود قرآن مجید میں اس واقعہ کے لئے رویا یعنی خواب کا لفظ استعمال ہوا ہے (بنی اسرائیل۔۶۰) آپ ان حضرات کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرسکتے ہیں، انہیں گالیاں دینا کونسے اسلام میں لکھا ہے؟

جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے، کتاب جلدی میں لکھی اور طبع کروائی گئی ہے۔ اگر اس کی نوک پلک سنوار لی جاتی تو یہ ایک عمدہ دستاویز بن جاتی، اس موجودہ صورت میں بھی نیم تعلیم یافتہ علماء کی جانب سے پرویز صاحب پر لگائے گئے اعتراضات کا یہ ایک مسکت جواب ہے۔